غزلیں

فہرست

عرضِ مرتب

اُردو نے شمالی ہند میں جنم لیا اور ۱۳۲۶ء میں محمد تغلق کے زمانے میں دکن پہنچی۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ اُردو کا پہلا جملہ خواجہ فرید شکر گنج نے کہا ہے اور وہ یہ ہے۔

"پونوں کا چاند بالا ہوتا ہے"

اسی طرح اُردو شاعری کے بارے میں بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ حضرت امیر خسرو کے وہ اشعار جو اُنھوں نے فارسی اور ہندی کے میل جول سے لکھے ہیں اُردو شاعری کے پُرانے نمونے ہیں بعض ولی دکنی کو اُردو کا پہلا شاعر مانتے ہیں اور بعض شاہ میرانجی کو۔ بالکل اسی طرح بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اُردو کی پہلی غزل کبیر نے کہی جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے ؎

"ہمن ہے عشق مستانہ ہمن دنیا سے یاری ہے"

اور کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے غزل کی ابتدا کی لیکن اب یہ بات تقریباً ثابت ہو چکی ہے کہ اُردو کا پہلا شاعر شاہ میرانجی ہی ہے اور اُردو غزل کا بانی سلطان محمد قلی قطب شاہ۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ نے غزل کی ابتدا کی اور ولی نے اسے معراجِ کمال تک پہنچایا۔ ۱۷۲۲ء میں محمد شاہ کے زمانے میں ولی دوبارہ دہلی آئے اس بار ان کے ساتھ ان کا اُردو دیوان بھی تھا۔ ولی کی اُردو شاعری نے شمالی ہند کے تمام شعراء پر جو اس وقت تک فارسی میں طبع آزمائی کرتے تھے ایسا اثر کیا کہ وہ بھی اُردو میں شعر کہنے لگے۔ اس طرح اُردو شاعری نے شمالی ہند میں بھی اپنے قدم جما لئے۔ پھر اُردو شاعری کے اس پودے سے شاخیں پھوٹیں جو مختلف اصنافِ سخن کی صورت میں ظہور میں آئیں۔ ہر دور کے شعراء حضرات اور اہل علم نے اسے اپنے خون سے سینچا۔ تب کہیں یہ پودا ایک تناور درخت بنا۔ اب اس کی جڑیں اس قدر

مضبوط ہو چکی ہیں کہ بادِ مخالف کا اس پر کوئی اثر ہو ہی نہیں سکتا۔ البتہ ڈر ہے تو اتنا کہ کہیں یہ نہ کہنا پڑے کہ ؎

"اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے"

کہیں اس کے محافظ ہی اس کی جڑیں کھوکھلی نہ کر دیں اور یہ درخت دھڑام سے زمین پر آرہے۔

اُردو میں اصنافِ سخن میں سب سے زیادہ اہمیت غزل کو حاصل ہے۔ تمام بڑے بڑے شاعروں نے اپنی شاعرانہ زندگی کی ابتدا غزل ہی سے کی اور اسے ہی اپنے جذبات و خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔

غزل کا میدان بڑا وسیع ہے۔ اس صنفِ شاعری سے حیات و کائنات کی تمام باریکیاں فکر و نظر کی بلندیاں ظہور میں آجاتی ہیں۔ اسی لئے اس کی افادیت اور اہمیت مسلّم ہے۔

زیرِ نظر انتخاب غزل کی مسلمہ حقیقت و اہمیت کو منوانے کے لئے نہیں کیا گیا بلکہ اس کا واحد مقصد اس بیش بہا خزانے کو ہر خاص و عام تک پہنچانا ہے۔ اس دور میں جبکہ چاروں طرف سے اُردو کے چراغ کو بجھانے کی ناکام کوشش کی جارہی ہے۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ہم بجائے قدم پیچھے ہٹانے کے، آگے بڑھیں اور ہر بے جا مخالفت کا ڈٹ کر مقابلہ کریں اور مخالفین پر ثابت کر دیں کہ یہ کوئی غیر ملکی سکہ نہیں جس کا ہندوستان میں چلنا مشکل ہے۔ یہ ہندوستان ہی کی پیداوار ہے۔ یہیں پھولی پھلی اور پروان چڑھی۔ یہ ہمارا قومی ورثہ ہے جس کی حفاظت ہمارا پہلا فرض ہے۔

اس انتخاب کے سلسلے میں مجھے "نقوش" کے غزل نمبر سے بڑی مدد ملی ہے۔ اس لئے میں ادارہ "نقوش" کا اور ان شعرا حضرات کا جنھوں نے میرے ساتھ تعاون فرمایا بے حد ممنون ہوں۔

شاھد علی خاں

یاد کرنا ہر گھڑی اس یار کا
ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا

آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں
تشنہ لب ہوں شربتِ دیدار کا

عاقبت کیا ہووے گا؟ معلوم نئیں
دل ہوا ہے مبتلا دلدار کا

کیا کہے تعریفِ دل ہے بے نظیر
حرف حرف اُس مخزنِ اسرار کا

گر ہوا ہے طالبِ آزادگی
بندہ مت ہو سبحہ و زنار کا

مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی
دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

اے ولی ہونا سری جن پر نثار
مدعا ہے چشمِ گوہر بار کا

ولی دکنی

ے گرے

جسے عشق کا تیرِ کاری لگے
اُسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے
نہ چھوڑے محبت دمِ مرگ تگ
جسے یار جانی سوں یاری لگے
نہ ہوئے اُسے جگ میں ہرگز قرار
جسے عشق کی بے قراری لگے
ہر اک وقت مجھ عاشقِ پاک کوں
پیارے تری بات پیاری لگے
ولی کوں کہے تو اگر یک بچن
رقیباں کے دل میں کٹاری لگے

ولی دکنی

آتا ہے صبح اُٹھ کر تیری برابری کو
کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشیدِ خاوری کو

دِل مارنے کا نسخہ پہنچا ہے عاشقوں تک
کیا کوئی جانتا ہے اس کیمیا گری کو

اس تند خو صنم سے ملنے لگا ہوں جب سے
ہر کوئی مانتا ہے میری دلاوری کو

اپنی فسوں گری سے اب ہم تو ہار بیٹھے
بادِ صبا یہ کہنا اس دِل رُبا پری کو

"اب خواب میں ہم اس کی صورت کو ہیں ترستے
اے آرزو ہوا کیا بختوں کی یاوری کو"

سراج الدّین علی خاں آرزو

جان! اگر دشمن ہوئے ہو تم ہمارے اِس قدر
تو ہمارے دل کو کیوں لگتے ہو پیارے اس قدر

گاہ گاہے پیار کی آنکھوں سوں کرتا ہے نگاہ
مہرباں ہوتا چلا ہے اب تو بارے اس قدر

دیکھنے کو دوڑتے ہیں لوگ بھونچپا سمجھ
آہ سے دل کے نِکلتے ہیں شرارے اس قدر

عاجزوں کو بے گنہ آزار دینا خوب نہیں
ڈر خدا سے! آبرو کو مت ستارے اس قدر

نجم الدین عرف شاہ مبارک آبرو

تمہارے عشق میں ہم ننگ و نام بھول گئے
جہاں کے کام تھے جتنے، تمام بھول گئے

گئے تھے زعم میں اپنے، پر اس کو دیکھتے ہی
جو دل نے ہم سے کہے تھے پیام بھول گئے

تری طرف ہوئی صورت گرانِ چیں کی نگاہ
قلم کو ہاتھ سے رکھ، اپنا کام بھول گئے

تری یہ زلفِ گرہ گیر دیکھ کر صیّاد
شکار آپ ہوئے، صید و دام بھول گئے

بڑا غضب ہے کہ حاتم کو تم نہ پہچانا
وہی قدیم تمہارا غلام، بھول گئے

شیخ ظہور الدین عرف شاہ حاتم

ظالم! تجھے قسم ہے، جو اس کو جلا نہ دے
یہ دل بھی دل نہ ہووے، جو تجھ کو دعا نہ دے

قاتل کے کیوں قدم سی تڑپ کر پڑا ہے دور
بسمل! تو اپنے ہاتھ سے شرطِ وفا نہ دے

بے طرح جوشِ گُل نے چمن میں لگائی آگ
ڈرتا ہوں آشیانے کو کافر جلا نہ دے

تیرے ہی دل سے پوچھئے اس غم کو ہاں فغاں
اُلفت بُری بلا ہے، کسی کو خدا نہ دے

اشرف علی خاں فغاں

جو اس شور سے میرؔ روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح
تو کب تک مرے مُنہ کو دھوتا رہے گا

مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے
جرس کے بھی جو ہوش کھوتا رہے گا

میں وہ رونے والا چلا ہوں جہاں سے
جسے ابر ہر سال روتا رہے گا

بس اے میرؔ مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو
تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

محمد تقی میرؔ

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دم کے جانے کا نہایت غم رہا

حسن تھا تیرا بہت عالم فریب
خط کے آنے پر بھی اک عالم رہا

دل نہ پہنچا گوشۂ داماں تلک
قطرۂ خوں تھا مژہ پر جم رہا

سنتے ہیں لیلیٰ کے خیمہ کو سیاہ
اس میں مجنوں کا دلے ماتم رہا

جامۂ احرام زاہد پر نہ جا
تھا حرم میں لیک نامحرم رہا

زلفیں کھولے تو تو ٹک آیا نظر
عمر بھر یاں کام دل برہم رہا

اس کے لب سے تلخ ہم سنتے رہے
اپنے حق میں آب حیواں سم رہا

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی
ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

صبح پیری شام ہونے آئی میر
تو نہ چیتا، یاں بہت دن کم رہا

محمد تقی میر

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا! اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا
عہدِ جوانی رو رو کاٹا، پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے، صبح ہوئی آرام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اس کے اور گئے، پر سجدہ ہر ہر گام کیا
کس کا کعبہ، کیسا قبلہ، کون حرم ہے، کیا احرام
کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا
یاں کے سپید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے، سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا، یا دن کو جوں توں شام کیا
ساعدِ سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لا کر چھوڑ دیئے
بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا
ایسے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی
سحر کیا، اعجاز کیا، جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا
میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو، ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

محمد تقی میر

دل! مت ٹپک نظر سے کہ پایا نہ جائے گا
جوں اشک پھر زمیں سے اٹھایا نہ جائے گا

رخصت ہے باغباں کہ ٹک اک دیکھ لیں چمن
جاتے ہیں واں، جہاں سے پھر آیا نہ جائے گا

تیغِ جفائے یار سے دل! سر نہ پھیریو
پھر منہ وفا کو ہم سے دکھایا نہ جائے گا

آوے گا وہ چمن میں نہ اے ابر جب تلک
پانی گلوں کے منہ سے چوایا نہ جائے گا

ظالم! میں کہہ رہا کہ تو اس خو سے درگزر
سوداؔ کا قتل ہے یہ چھپایا نہ جائے گا

دامانِ داغِ تیغ جو دھویا، تو کیا ہوا
عالم کے دل سے داغ، مٹایا نہ جائے گا

محمد رفیع سوداؔ

گُل پھینکے ہے اوروں کی طرف، بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر اندازِ چمن! کچھ تو اِدھر بھی

کیا ضد ہے مرے ساتھ خدا جانئے! ورنہ
کافی ہے تسلّی کو مرے ایک نظر بھی

اے ابر! قسم ہے تجھے رونے کی ہمارے
تجھ چشم سے ٹپکا ہے کبھو لختِ جگر بھی

کس ہستیٔ موہوم پہ نازاں ہے تو اے یار!
کچھ اپنے شب و روز کی ہے تجھ کو خبر بھی

تنہا ترے ماتم میں نہیں شام سیہ پوش
رہتا ہے سدا چاک، گریبانِ سحر بھی

سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
آئی ہے سحر ہونے کو ٹک تو کہیں مر بھی

محمد رفیع سودا

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا
بس ہجومِ یاس ! جی گھبرا گیا

تجھ سے کچھ دیکھا نہ ہم نے، جز جفا
پر وہ کیا کچھ ہے کہ جی کو بھا گیا

کھل نہیں سکتی ہیں اب آنکھیں مری
جی میں یہ کس کا تصوّر آ گیا

میں نے تو ظاہر نہ کی تھی دل کی بات
پر مری نظروں کے ڈھب سے پا گیا

پی گئی کتنوں کا لوہو تیری یاد
غم ترا کتنے کلیجے کھا گیا

مٹ گئی تھی اس کے جی سے تو جھجک
درد کچھ بک بک کے تو چونکا گیا

خواجہ میر درد

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں

مٹ جائیں ایک آن میں کثرت نمائیاں
ہم آئینہ کے سامنے جب آ کے ہُو کریں

تردامنی پہ شیخ، ہماری نہ جائیو!
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

سر تا قدم زبان ہیں جوں شمع گو کہ ہم
پر یہ کہاں مجال جو کچھ گفتگو کریں

ہر چند آئینہ ہوں پر اتنا ہوں ناقبول
منہ پھیر لے وہ جس کے مجھے روبرو کریں

نے گُل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہی اعتبار
کس بات پر چمن ہوسِ رنگ و بو کریں

ہے اپنی یہ صلاح کہ سب زاہدانِ شہر
اے دردؔ آ کے بیعتِ دستِ سبو کریں

خواجہ میر دردؔ

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے! بس چلتا نہیں، کیا مفت جاتی ہے بہار

لالہ و گُل نے ہماری خاک پر ڈالا ہے شور
کیا قیامت ہے موؤں کو بھی ستاتی ہے بہار

نرگس و گُل کی کھلی جاتی ہیں کلیاں دیکھیو سب
پھر انھیں خوابیدہ فتنوں کو جگاتی ہے بہار

ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن میں لیک
جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں آتی ہے بہار

شاخِ گُل ہلتی نہیں پر بلبلوں کو باغ میں
ہاتھ اپنے کے اشارے سے بلاتی ہے بہار

مرزا مظہر جانِ جاناں

مری جان جاتی ہے، یارو! سنبھالو!
کلیجے میں کانٹا چبھا ہے، نکالو
نہ بھائی مجھے زندگانی نہ بھائی
مجھے مار ڈالو، مجھے مار ڈالو
خدا کے لئے! اے مرے ہم نشینو!
یہ بانکا جو جاتا ہے اس کو بلالو
اگر وہ نہ آوے تمہارے کہے سے
تو منت کرو، گھیرے گھیر سے بلا لو!
اگرچہ خفا ہو کے وہ گالیاں دے
تو دم لے رہو، کچھ نہ بولو نہ چالو
کہو ایک بندہ تمہارا مرے ہے
اسے جاں کنی سے تو جا کر بچالو!
جلوں کی بری آہ ہوتی ہے پیارے
تم اس سوز کی اپنے حق میں دعا لو

سیّد محمد سوز

رہا مرتے مجھے غم اسی کا
نہیں بعد میرے کوئی بے کسی کا

گیا تیغِ قاتل نے جب کام اپنا
میں منہ دیکھتا رہ گیا بے بسی کا

عبث ہے غرض اُن بُتاں سے بھی ملنا
نہیں آج دنیا میں کوئی کسی کا

کیا حسن سے اُس نے آگاہ اُس کو
الٰہی! ہو خانہ خراب آرسی کا

ہدایت کہا ریختہ جب سے ہم نے
رواج اُٹھ گیا ہند سے فارسی کا

حکیم ہدایت اللہ خاں ہدایت

ہم ہیں بے دل، دل اپنے پاس نہیں
آہ! اس کا بھی تجھ کو پاس نہیں
بے وفا کچھ نہیں تری تقصیر
مجھ کو میری وفا ہی راس نہیں
قتل میرا ہے، تیری بدنامی
جان کا ورنہ کچھ ہراس نہیں
تو ہی بہتر ہے ہم سے آئینے!
ہم تو اتنے بھی روشناس نہیں
یوں خدا کی خدائی برحق ہے
پر اثرؔ کی ہمیں تو آس نہیں

سیّد محمد میر اثرؔ

تجھ سے جب وقت کہ خالی یہ مکاں رہتا ہے
مجھ کو تنہائی میں پہروں خفقاں رہتا ہے

شکوہ ہم کرتے ہیں کیوں رسم ہے دنیا کی یہی
دل جو لگتا ہے، تو پھر پاس کہاں رہتا ہے

جو ترے پاس سے آتا ہے، میں پوچھوں ہوں یہی
کیوں جی اکچھ ذکر ہمارا بھی وہاں رہتا ہے

پنکھڑی گُل کی جو کروٹ تلے اُس کے آئے
نازک اتنا ہے بدن اس کا، نشاں رہتا ہے

ق
اس ستم گر سے ہمارے جو کسی نے پوچھا
کوئی رنگینؔ بھی ترے کوچہ میں یاں رہتا ہے

تو کچھ اک ناز سا کھا، چیں بہ جبیں ہو کے وہیں
گالی دے کر یہ کہا اس نے کہ ہاں رہتا ہے

سعادت یار خاں رنگینؔ

جس گھڑی تیرے آستاں سے گئے
ہم نے جانا کہ دو جہاں سے گئے

تیرے کوچے میں نقشِ پا کی طرح
ایسے بیٹھے کہ پھر نہ واں سے گئے

شمع کی طرح رفتہ رفتہ ہم
ایسے گزرے کہ جسم و جاں سے گئے

ق

ایک دن میں نے یار سے یہ کہا
اب تو ہم طاقت و تواں سے گئے

ہنس کے بولا کہ سُن لے اے آصف
یہی کہہ کہہ کے لاکھوں جاں سے گئے

نواب وزیر آصف الدولہ بہادر یحییٰ خاں آصف

گر اُس منہ سے برقعہ کبھی کھل گیا
تو دیکھو گے مہ خاک میں رُل گیا

گیا جان سے ایک عالم میاں
ولیکن نہ تیرا تغافل گیا

رہا ہے کہاں ہم میں آرام صبر
وہ طاقت گئی وہ تحمل گیا

ہمیں دے گیا داغ جاتے ہوئے
غرض اس گلستاں سے جو گُل گیا

وہی رنگِ گُل ہے، وہی چہچہے
چمن سے کہاں شورِ بلبُل گیا

لگی چوٹ دل کو مرے داغ سے
سحر نالہ کرتا جو بلبل گیا

میں کہتا تھا عاشق نہ ہو مصحفی
تو ایسی ہی باتوں میں تو گھُل گیا

شیخ غلام ہمدانی مصحفی

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا
ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا

میرے پہلو میں رات جا کر وہ
ماہ تھا یا ہلال تھا کیا تھا

چمکی بجلی سی پر نہ سمجھے ہم
حسن تھا یا جمال تھا کیا تھا

جس کو ہم روزِ ہجر سمجھے تھے
ماہ تھا یا وہ سال تھا کیا تھا

مصحفیؔ شب جو چپ تو بیٹھا تھا
کیا تجھے کچھ ملال تھا کیا تھا

شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ

جاتا تھا اس کے کھوج میں، میں بے خبر چلا
بارے اسی نے ٹوک کے پوچھا، کدھر چلا

جس اشتیاق سے کہ میں آتا ہوں تیرے پاس
کیا ہو جو آوے تو بھی یوں ہی بے خبر چلا

غیروں میں اس نے منہ تو چھپایا تھا مجھ کو دیکھ
پر میں بھی اس کی چھیڑ سے منہ ڈھانپ کر چلا

کس میں رکھوں گا اب مئے حسرت کو میں بھلا
شیشہ تو دل کا خونِ جگر ہی سے بھر چلا

لکھنے کی یاں نہ تاب، نہ پڑھنے کا واں دماغ
کہہ دیں گے کچھ زبانی، اگر نامہ بر چلا

کچھ رات غیر کی جو کہیں نکلی اس سے بات
سُن سُن کے میں خفا ہو، وہیں روٹھ کر چلا

غصّہ میں دیکھ مجھ کو لگا کہنے: اور لو!
اک بات بس کہی نہ کہی، یہ تو مر چلا

اب کوئی آوے یا کہ نہ آوے حسنؔ کو کیا
بے چارہ اپنی جان سے آپ ہی گزر چلا

میر غلام حسن حسنؔ

دل بر سے ہم اپنے جب ملیں گے
اس گم شدہ دل سے تب ملیں گے

یہ کس کو خبر ہے، اب کے بچھڑے
کیا جانیے! اس سے کب ملیں گے

دنیا ہے، سنبھل کے دل لگانا
یاں لوگ عجب عجب ملیں گے

ظاہر میں تو ڈھب نہیں ہے کوئی
ہم یار سے کس سبب ملیں گے

آرام حسنؔ تب ہی تو ہوگا
اس لب سے جب اپنے لب ملیں گے

میر غلام حسن حسنؔ

سُنا ہے وہ خدا نا کردہ ہے بیمار کیا کیجے
عیادت کو بھی جانا ہے ہمیں دشوار کیا کیجے

خیال اوس کی جو بجوابی کا گذرے ہے تو ہم شب کو
لگا کے چھت سی آنکھیں رہتے ہیں بیدار کیا کیجے

کسی کو بھیج بھی سکتے نہیں احوال پرسی کو
مگر یہ چپکے چپکے کہتے ہیں ہر بار کیا کیجے

کفِ افسوس ملتے ہیں کہ جرأت ہم نہیں اوس جا
نہیں تلوے تو سہلاتے گھڑی دو چار کیا کیجے

شیخ قلندر بخش جرأت

ذرا ہم اس سے لگ چلنے کے سو سو ڈھب لگاتے ہیں
رسائی جو نہیں پاتے تو کیا کیا تلملاتے ہیں

غضب یہ ہے کہ واں جاتے ہیں تو خالی پھر آتے ہیں
اگر جاتے نہیں تو جی ہی سے ہم اپنے جاتے ہیں

لی رہتی تھیں جو نظروں سے نظریں سو کہاں اب تو
کبھی ہم اتفاقاً اک جھلک سی دیکھ پاتے ہیں

نظر آتا ہے باہم اب جو وصل و ہجر کا عالم
کبھی روتے ہیں آپ اپنے پر اور گہ مسکراتے ہیں

خدا شاہد ہے وہ ہیں جان میں بس جان آتی ہے
کبھی صاحب جو آواز اپنے بندے کو سناتے ہیں

برنگِ موج جب بیتاب ہوتا ہے یہ دل بر میں
تو ہم رو رو کے دریا اپنی آنکھوں سے بہاتے ہیں

قلق گذرے ہے یہ دل پر کہ بس میں مرنے لگتا ہوں
دکھانے میں جو صورت آپ کچھ عرصہ لگاتے ہیں

مناسب گرچہ جانا بار بار اُس جا نہیں جرأت
دلے کیا کیجیے بے تابی سے ہم لاچار جاتے ہیں

شیخ قلندر بخش جرأت

اچھا جو خفا ہم سے ہو تم اے صنم اچھّا
لو ہم بھی نہ بولیں گے خدا کی قسم اچھّا

مشغول کیا چاہیئے اس دل کو کسی طور
لے لیویں گے ڈھونڈ اور کوئی یار ہم اچھا

گرمی نے کچھ آگ اور ہی سینے میں لگا دی
ہر طور غرض آپ سے ملنا ہے کم اچھّا

اغیار سے کرتے ہو مرے سامنے باتیں
مجھ پر یہ لگے کرنے نیا تم ستم اچھّا

کہہ کر گئے: آتا ہوں کوئی دم میں، میں تم پاس
پھر دے چلے کل کی سی طرح مجھ کو دم اچھّا

اس ہستیٔ موہوم سے میں تنگ ہوں انشاؔء
واللہ کہ اس سے بمراتب عدم اچھّا

سیّد انشاء اللہ خاں انشاؔء

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے، باقی جو ہیں، تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نگہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں، ہم بیزار بیٹھے ہیں

تصوّر عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

بسانِ نقشِ پائے رہرواں کوئے تمنّا میں
نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

یہ اپنی چال ہے اُفتادگی سے اب کہ پہروں تک
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں

کہاں صبر و تحمّل۔ آہ ننگ و نام کیا شے ہے
یہاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم یکبار بیٹھے ہیں

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو!
جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں، ہم بیکار بیٹھے ہیں

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاؔ
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

سید انشاء اللہ خاں انشاءؔ

نظر پڑا اک بُت پری وش، نرالی سج دھج، نئی ادا کا

جو عمر دیکھو، تو دس برس کی، پہ قہر و آفت، غضب خدا

جو شکل دیکھو، تو بھولی بھولی جو باتیں سنیے تو میٹھی میٹھی

پہ دل وہ پتھر کہ سر اُڑا دے، جو نام لیجے کبھی دفا کا

جو گھر سے نکلے تو یہ قیامت کہ چلتے چلتے قدم قدم پر

کسی کو ٹھوکر کسی کو جھڑکی، کسی کو گالی، نپٹ لڑا کا

یہ راہ چلنے میں چلبلاہٹ کہ دل کہیں ہے، نظر کہیں ہے

کہاں کا اُونچا، کہاں کا نیچا، خیال کس کو، قدم کی جا کا

لڑا دے آنکھیں وہ بے حجابی کہ پھر پلک سے پلک نہ مارے

نظر جو نیچی کرے، تو گویا کھلا سراپا چمن حیا کا

یہ چنچلاہٹ، یہ چلبلاہٹ، خبر نہ سر کی، نہ تن کی سُدھ بُدھ

جو چیرا بکھرا، بلا سے بکھرا، نہ بند باندھا کبھو قبا کا

گلے لپٹنے میں یہ شتابی کہ مثلِ بجلی کے اضطرابی

کہیں جو چمکا، چمک چمک کر کہیں جو لپکا، تو پھر چھپا کا

نہ وہ سنبھالا کسی کے سنبھلے، نہ وہ منایا منے کسی کے

جو قتلِ عاشق پہ آ کے مچلے، تو غیر کا پھر نہ آشنا کا

نظیرؔ ہٹ جا، پرے سرک جا، بدل لے صورت، چھپا لے منہ کو

جو دیکھ لیوے گا وہ ستم گر، تو یار ہوگا ابھی جھڑا کا

سید ولی محمد نظیرؔ اکبر آبادی

دور سے آئے تھے ساقی، سن کے میخانے کو ہم
بس ترستے ہی چلے افسوس! پیمانے کو ہم

مے بھی ہے، مینا بھی ہے، ساغر بھی ہے، ساقی نہیں
دل میں آتا ہے لگا دیں آگ مے خانے کو ہم

ہم کو پھنسنا تھا قفس میں، کیا گلہ صیّاد کا
بس ترستے ہی رہے ہیں آب اور دانے کو ہم

طاقِ ابرو میں صنم کے، کیا خدائی رہ گئی؟
اب تو پوجیں گے اسی کافر کے بت خانے کو ہم

باغ میں لگتا نہیں، صحرا سے گھبراتا ہے دل
اب کہاں لے جا کے بیٹھیں ایسے دیوانے کو ہم

کیا ہوئی تقصیر ہم سے، تو بتا دے اے نظیر
تاکہ شادی مرگ سمجھیں، ایسے مرجانے کو ہم

سید ولی محمد نظیر اکبر آبادی

قدم نہ رکھ مرے چشم پُر آب کے گھر میں
بھرا ہے موج کا طوفاں، حباب کے گھر میں

کہے ہے دیکھ کے وہ عکسِ رُخ بہ ساغرِ مے
نزدلِ ماہ ہوا، آفتاب کے گھر میں

مدام رند کریں کیوں نہ آستاں بوسی،
حرم ہے شیخِ مشیخت مآب کے گھر میں

ہمارے دل میں کہاں آبلے ہیں اے ساقی
چنے ہوئے ہیں یہ شیشے شراب کے گھر میں

دلا! نہ کیوں کہ کروں اختلاط کی باتیں
حجاب کیا ہے اب اس بے حجاب کے گھر میں

نصیرؔ دیکھ! تو کیا جلوۂ خدائی ہے
ہمارے اس بتِ خانہ خراب کے گھر میں

شاہ نصیرالدین نصیرؔ

آہ کو چاہیئے اک عمر، اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں! کیا گزرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنّا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں، خونِ جگر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے، لیکن
خاک ہوجائیں گے ہم، تم کو خبر ہونے تک

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو، فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

یک نظر بیش نہیں، فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو، جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اسد اللہ خاں غالب

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم، غیر ہمیں اُٹھائے کیوں

جب وہ جمالِ دل فروز، صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں منہ چھپائے کیوں

دشنۂ غمزہ جاں ستاں، ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رُخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی، غم سے نجات پائے کیوں

حسن اور اس پہ حسنِ ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں؟

واں وہ غرورِ عز و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں

ہاں! وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی!
جس کو ہو دین و دل عزیز، اس کی گلی میں جائے کیوں

غالبِؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا، کیجئے ہائے ہائے کیوں

اسد اللہ خاں غالب

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے　　آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار　　یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے؟
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں　　کاش! پوچھو کہ مدعا کیا ہے
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود　ق　پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟　　غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے　　نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں　　ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے
ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید　　جو نہیں جانتے، وفا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں　　میں نہیں جانتا، دُعا کیا ہے
ہاں! بھلا کر! ترا بھلا ہوگا　　اور درویش کی صدا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

اسد اللہ خاں غالبؔ

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا — رنج، راحت فزا نہیں ہوتا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے — ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

اس نے کیا جانے، کیا کیا لے کر — دل کسی کام کا نہیں ہوتا

نارسائی سے دم رُکے، تو رُکے — میں کسی سے خفا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

حالِ دل یار کو لکھوں کیوں کر — ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا

دامن اس کا جو ہے دراز تو ہو — دستِ عاشق رسا نہیں ہوتا

چارۂ دل سوائے صبر نہیں — سو تمھارے سوا نہیں ہوتا

کیوں سُنے عرضِ مضطر اے مومنؔ
صنم آخر خُدا نہیں ہوتا

حکیم محمد مومن خاں مومنؔ

رو یا کریں گے آپ بھی پہروں اسی طرح
اٹکا کہیں جو آپ کا دل بھی مری طرح

مر چک کہیں کہ اس غمِ ہجراں سے چھوٹ جائے
کہتے تو ہیں بھلے کی، ولیکن بُری طرح

نے تاب ہجر میں ہے، نہ آرام وصل میں
کم بخت دل کو چین نہیں ہے کسی طرح

لگتی ہیں گالیاں بھی ترے منہ سے کیا بھلی
قربان تیرے! پھر مجھے کہہ لے اسی طرح

پامال ہم نہ ہوتے فقط جورِ چرخ سے
آئی ہماری جان پہ آفت کئی طرح

نے جائے واں بنے ہے، نہ بن جائے چین ہے
کیا کیجیے! ہمیں تو ہے مشکل سبھی طرح

ہوں جاں بلب بُتانِ ستم گر کے ہاتھ سے
کیا سب جہاں میں جیتے ہیں مومن اسی طرح

حکیم محمد مومن خاں مومن

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھے بیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گلے، وہ شکایتیں، وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی بیٹھے سب میں جو روبرو، تو اشارتوں ہی سے گفتگو
وہ بیان شوق کا برملا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کوئی بات ایسی اگر ہوئی کہ تمھارے جی کو بری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی، کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کہا میں نے بات وہ کوٹھے کی، مرے دل سے صاف اتر گئی
تو کہا کہ جانے مری بلا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ بگڑنا وصل کی رات کا، وہ نہ ماننا کسی بات کا
وہ نہیں نہیں کی ہر آن ادا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے آشنا، جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنِ مبتلا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

حکیم محمد مومن خاں مومن

کسی بے کس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا
جو آپ ہی مر رہا ہو، اس کو گر مارا تو کیا مارا

نہ مارا آپ کو، جو خاک ہو اکسیر بن جاتا
اگر پارے کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا

نہیں وہ قول کا سچا، ہمیشہ قول دے دے کر
جو اس نے ہاتھ میرے ہاتھ پر مارا تو کیا مارا

ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثلِ قلقلِ مینا
کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا

دلِ سنگینِ خسرو پر بھی ضرب اے کوہ کن پہنچا
اگر تیشہ سرِ کہسار پر مارا تو کیا مارا

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے پر
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

دلِ بد خواہ میں تھا مارنا، یا چشمِ بد بیں میں
فلک پر ذوقؔ تیرِ آہ گر مارا تو کیا مارا

شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ

کیا آئے، تم جو آئے گھڑی دو گھڑی کے بعد
سینے میں ہوگی سانس اڑی دو گھڑی کے بعد

کیا روکا اپنے گریہ کو ہم نے کہ لگ گئی!
پھر وہ ہی آنسوؤں کی جھڑی دو گھڑی کے بعد

کوئی گھڑی اگر وہ ملائم ہوئے تو کیا
کہہ بیٹھیں گے پھر ایک کڑی دو گھڑی کے بعد

کہتا رہا کچھ اُن سے عدو دو گھڑی تلک!
غماز نے پھر اور جڑی دو گھڑی کے بعد

تھے دو گھڑی سے شیخ جی شیخی بگھارتے
ساری وہ .. شیخی اُن کی جھڑی دو گھڑی کے بعد
شیخ محمد ابراہیم ذوق

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

لے گیا چھین کے کون آج ترا صبر و قرار
بے قراری تجھے اے دل! کبھی ایسی تو نہ تھی

تری آنکھوں نے خدا جانے کیا کیا جادو
کہ طبیعت مری مائل کبھی ایسی تو نہ تھی

عکسِ رخسار نے کس کے ہے تجھے چمکایا
تاب تجھ میں مہِ کامل کبھی ایسی تو نہ تھی

کیا سبب تو جو بگڑتا ہے ظفرؔ سے ہر بار
خو تری حورِ شمائل کبھی ایسی تو نہ تھی

ابوظفر سراج الدین ظفر

دیا اپنی خودی کو جو ہم نے اُٹھا، وہ جو پردہ سا بیچ میں تھا نہ رہا
رہے پردہ میں اب نہ وہ پردہ نشیں، کوئی دوسرا اس کے سوا نہ رہا

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

ترے رُخ کے خیال میں کون سے دن اُٹھے مجھ پہ نہ فتنۂ روزِ جزا
تری زُلف کے دھیان میں کون سی شب مرے سر پہ ہجوم بلا نہ رہا

ہمیں ساغرِ بادہ کے دینے میں تو کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عہدِ نشاط، یہ دورِ طرب، نہ رہے گا جہاں میں سدا، نہ رہا

کئی روز میں آج وہ ماہ لقا، ہوا میرے جو سامنے جلوہ نما
مجھے صبر و قرار ذرا نہ رہا، اسے پاسِ حجاب و حیا نہ رہا

ترے خنجر و تیغ کی آب رواں ہوئی جبکہ سبیلِ ستم زدگاں
گئے کتنے ہی قافلے خشک زباں، کوئی تشنۂ آبِ بقا نہ رہا

اسے چاہا تھا میں نے کہ روک رکھوں مری جان بھی جائے تو جانے نہ دوں
کئے لاکھ فریب، کروڑ فسوں، نہ رہا، نہ رہا، نہ رہا، نہ رہا

لگے یوں تو ہزاروں ہی تیرِ ستم کہ تڑپتے رہے پڑے خاک پہ ہم
ولے ناز و کرشمہ کی تیغِ دو دم لگی ایسی کہ تسمہ لگا نہ رہا

ظفرؔ آدمی اس کو نہ جانئے گا ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

ابوظفر سراج الدین ظفرؔ

مت چھیڑ کہ یار سے جُدا ہوں
اے مرگ! میں آپ مر رہا ہوں

ممکن نہیں بن ملے، نبا ہوں
بیگانہ آشنا نما ہوں

لیلیٰ کہے سے بگڑ گئے تھے
دیوانہ میں جان کر بنا ہوں

کہتا ہوں جو غیر سے نہ ملئے
کہتا ہے کہ کیا میں بے وفا ہوں

اس غیرتِ گل سے ربط معلوم
ہرچند میں ہمدمِ صبا ہوں

ہمدم! نہ سہی محبّت اُس کو
اس بات پہ کیا اُسے نہ چاہوں

مکشوف ہوا فروغِ مے سے
ذرّہ میں کس آفتاب کا ہوں

میں شیفتہ ہوں عزیزِ دلہا
شیریں گفتار، خوش نوا ہوں

نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ

ساتھ اپنے جو مجھے یار نے سونے نہ دیا
رات بھر مجھ کو دلِ زار نے سونے نہ دیا

خواب ہی میں نظر آتا وہ شبِ ہجر کہیں
سو مجھے حسرتِ دیدار نے سونے نہ دیا

خفتگی بخت کی کیا کہیئے کہ جز خوابِ عدم
عمر بھر دیدۂ بیدار نے سونے نہ دیا

یہی صیّاد گِلا کرتا ہے میرا، ہر صبح
نالۂ مرغِ گرفتار نے سونے نہ دیا

سمجھے تھے بعدِ فنا پائیں گے راحت ناسخ
حشر تک وعدۂ دیدار نے سونے نہ دیا

شیخ امام بخش ناسخ

سب ہمارے لئے زنجیر لئے پھرتے ہیں
ہم سرِ زلفِ گرہ گیر لئے پھرتے ہیں

کون تھا صیدِ وفادار کہ اب تک صیّاد
بال و پر اس کے ترے تیر لئے پھرتے ہیں

تیری صورت سے کسی کی نہیں ملتی صورت
ہم جہاں میں تری تصویر لئے پھرتے ہیں

جو ہے، مرتا ہے، بھلا کس کو عداوت ہوگی
آپ کیوں ہاتھ میں شمشیر لئے پھرتے ہیں

شیخ امام بخش ناسخ

سن تو سہی، جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا؟
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خُدا، غائبانہ کیا؟

زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گُل، سو زر بکف
قاروں نے راستے میں لٹایا، خزانہ کیا

چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر
دل صاف ہو ترا، تو ہے آئینہ خانہ کیا

صیّاد! اسیرِ دامِ رگِ گل ہے عندلیب
دکھلا رہا ہے چھپ کے اسے دام و دانہ کیا

طبل و علم نہ پاس ہے اپنے، نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

آتی ہے کس طرح سے مری قبضِ روح کو
دیکھوں تو موت ڈھونڈ رہی ہے بہانہ کیا

ترچھی نگہ سے طائرِ دل ہو چکا شکار
جب تیر کج پڑے گا، اُڑے گا نشانہ کیا

یوں مدعی حسد سے نہ دے داد، تو نہ دے
آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

خواجہ حیدر علی آتش

تیرے کوچہ کا ہے اے خانہ خراب! افسانہ آج
شیخ کعبہ چھوڑتا ہے، برہمن بت خانہ آج

خوب رُو تجھ سا کوئی بازارِ عالم میں نہیں
قیمتِ یوسف نہ تھی جو ہے ترا بیعانہ آج

آمد آمد اس سراپا نور کی ہے بزم میں
شمع اُڑ جاوے، جو ہاتھ آئیں پرِ پروانہ آج

ہم نشیں! کہتے ہیں: ذکرِ عیش، نصفِ عیش ہے
میں کہوں، تو سُن! جمالِ یار کا افسانہ آج

مجھ سے دریا نوش کو ساقی پلاتا ہے شراب
دیکھتا ہوں میں بھی ظرفِ شیشہ و پیمانہ آج

نقش آسیب پری ہے صورتِ زیبا تری
ہوش میں آتا ہے تجھ کو دیکھ کر دیوانہ آج

میرے مرنے کی دعا مانگے وہ بت پڑھ کر نماز
کس طرف جا کر کروں میں سجدۂ شکرانہ آج

نزع کی مشکل بھی آساں ہوتی ہے آتش نہ ڈر
شاہِ مرداں سے طلب کر، ہمتِ مردانہ آج

خواجہ حیدر علی آتش

تیری طرف سے دل اے جانِ جاں اُٹھا نہ سکے
بہت ضعیف تھے بارِ گراں اُٹھا نہ سکے

ہزار بار بہار آئی، لیکن اے صیّاد
نگاہ ہم طرفِ بوستاں اُٹھا نہ سکے

اسیرِ زلف جو مرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں
ذرا بھی صدمۂ قیدِ گراں اُٹھا نہ سکے

سُنیں جو یار کی باتیں غش آ گیا ہم کو
یہ ناتواں تھے کہ لطفِ بیاں اُٹھا نہ سکے

میر وزیر علی صباؔ لکھنوی

مجھے دے کے دل، جان کھونا پڑا ہے
غرض ہاتھ دونوں سے دھونا پڑا ہے

جو رونا یہی ہے، تو پھوٹیں گی آنکھیں
مجھے اب تو آنکھوں کا رونا پڑا ہے

کیے سینکڑوں دل گھر محبت نے غارت
سنو جس محلّے ہیں، رونا پڑا ہے

میں پاتا نہیں دل کو سینے میں اپنے
کئی دن سے خالی یہ کونا پڑا ہے

کرو چل کے آباد، اب گور اے رندؔ!
بہت دن سے سُونا وہ کونا پڑا ہے

نواب سید محمد خاں رندؔ لکھنوی

جب ہو چکی شراب تو مَیں مست مر گیا
شیشے کے خالی ہوتے ہی پیمانہ بھر گیا

نے قاصدِ خیال، نہ پیکِ نظر گیا
اُن تک میں اپنی آپ ہی لے کر خبر گیا

سمجھا ہے حق کو اپنی ہی جانب ہر ایک شخص
یہ چاند اس کے ساتھ چلا، جو جدھر گیا

طوفانِ نوح اس میں ہو یا شورِ حشر ہو
ہونا جو کچھ ہے ہوگا، جو گزرا، گزر گیا

میں نے بھی آنکھیں دیکھی ہیں پریوں کی جاؤ بھی
تم نے دکھائی آنکھ مجھے، اور مَیں ڈر گیا

گزرا جہاں سے میں تو کہا سُن کے یار نے
قصّہ گیا، فساد گیا، دردِ سر گیا

کاغذ سیاہ کرتے ہو کس کے لئے نسیم
آیا جوابِ خط تمہیں اور نامہ بر گیا

پنڈت دیا شنکر نسیم

غیروں کو بھلا سمجھے اور مجھ کو بُرا جانا
سمجھے بھی تو کیا سمجھے، جانا بھی تو کیا جانا

اک عمر کے دُکھ پائے، سوتے ہیں فراغت سے
اے غلغلۂ محشر! ہم کو نہ جگا جانا

کیا یار کی بدخوئی کیا غیر کی بد خواہی
سرمایۂ صد آفت ہے دل ہی کا آجانا

کچھ عرضِ تمنّا میں شکوہ نہ ستم کا تھا
میں نے تو کہا کیا تھا اور آپ نے کیا جانا

چلمن کا اُلٹ جانا، ظاہر کا بہانہ ہے
ان کو تو بہ ہر صورت اک جلوہ دکھا جانا

ہے حق بہ طرف اس کے چاہے سو ستم کر لے
اس نے دلِ عاشق کو مجبورِ وفا جانا

انجام ہوا اپنا آغازِ محبت میں
اس شغل کو جاں فرسا ایسا تو نہ تھا جانا

مجروح ہوئے مائل کس آفتِ دوراں پر
اے حضرتِ من! تم نے دل بھی نہ لگا جانا

میر مہدی مجروح

خاطر سے یا لحاظ سے، میں مان تو گیا
جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

دل لے کے مفت کہتے ہیں، کچھ کام کا نہیں
اُلٹی شکایتیں ہوئیں، احسان تو گیا

دیکھا ہے بت کدہ میں، جو اے شیخ! کچھ نہ پوچھ
ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا

افشائے رازِ عشق میں گو ذلتیں ہوئیں
لیکن اُسے جتا تو دیا، جان تو گیا

ہوش و حواس و تاب و تواں داغ جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

نواب مرزا خاں داغ

شوخی نے تیری کام کیا اک نگاہ میں
صوفی ہے بت کدہ میں، صنم خانقاہ میں

آنکھیں بچھائیں ہم تو عدو کی بھی راہ میں
پہلے اگر یہ کہہ دو کہ تم ہو ہماری نگاہ میں

بڑھتا ہوں آگے، پوچھ کے اس سے مقامِ عشق
جو فتنہ مجھ غریب کو ملتا ہے راہ میں

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا، تمہاری نگاہ میں

راتیں مصیبتوں کی جو گزری تھیں آج تک
ماتم کو آئی ہیں مرے روزِ سیاہ میں

اس توبہ پر ہے ناز تجھے زاہد اس قدر
جو ٹوٹ کر شریک ہو میرے گناہ میں

آتی ہے بات بات مجھے یاد بار بار
کہتا ہوں دوڑ دوڑ کے قاصد سے راہ میں

کیسا نظارہ، کس کا اشارہ، کہاں کی بات
سب کچھ ہے اور کچھ نہیں، نیچی نگاہ میں

مشتاق اس صدا کے بہت درد مند تھے
اے داغ! تم تو بیٹھ گئے ایک آہ میں

نواب مرزا خاں داغ

اس کی حسرت ہے، جسے دل سے مٹا بھی نہ سکوں
ڈھونڈنے اس کو چلا ہوں، جسے پا بھی نہ سکوں

اُن کے غصّے کے مٹانے کی ہیں سو تدبیریں
لاگ کی آگ نہیں ہے کہ بجھا بھی نہ سکوں

چٹکیاں لینے سے دل میں وہ کریں کیا انکار
داغ کچھ دود نہیں ہے کہ دکھا بھی نہ سکوں

میں اگر گھر سے نکلتا ہوں، تو گھر کیوں ہو اُداس
کیا دمِ باز پسیں ہے کہ پھر آ بھی نہ سکوں

کوئی پوچھے تو محبت سے، یہ کیا ہے انصاف
وہ مجھے دل سے بھلا دے، میں بھلا بھی نہ سکوں

نقشِ ہستی، میں ابھی محو کیے دیتا ہوں
خطِ تقدیر نہیں ہے کہ مٹا بھی نہ سکوں

منشی امیر احمد امیرؔ مینائی

کہہ رہی ہے حشر میں وہ آنکھ شرمائی ہوئی
ہائے کیسی اس بھری محفل میں رسوائی ہوئی

آئینے میں ہر ادا کو دیکھ کر کہتے ہیں وہ
آج دیکھا چاہیے کس کس کی ہے آئی ہوئی

کہہ تو اے گل چیں! اسیرانِ قفس کے واسطے
توڑ لوں دو چار کلیاں میں بھی مرجھائی ہوئی

میں تو رازِ دل چھپاؤں پر چھپا رہنے بھی دے
جان کی دشمن، یہ ظالم آنکھ للچائی ہوئی

کیوں ترے لب پر تبسم مجلسِ ماتم میں ہے
یہ ہنسی بھی کیا مرے پھولوں میں ہے آئی ہوئی

گرد اُڑی عاشق کی تربت سے تو جھنجھلا کر کہا
واہ سر چڑھنے لگی، پاؤں کی ٹھکرائی ہوئی

شعر گلدستے میں مجھ افسردہ دل کے کیا امیرؔ
دامنِ گلچیں میں کچھ کلیاں ہیں مرجھائی ہوئی

منشی امیر احمد امیرؔ مینائی

پیش از ظہورِ عشق، کسی کا نشاں نہ تھا
تھا حُسن میزبان، کوئی میہماں نہ تھا
ملتے ہی اُن کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا
کیا جانتے تھے، جائے گا جی اک نگاہ میں
تھی دل کی احتیاط، مگر بیم جاں نہ تھا
سچ ہے کہ پاسِ خاطرِ نازک عذاب ہے
تھا دل کو جب فراغ کہ وہ مہرباں نہ تھا
رات ان کو بات بات پہ، سو سو دیے جواب
مجھ کو خود اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا
رونا ہے یہ کہ آپ بھی ہنستے ہیں، ورنہ یاں
طعنِ رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا
بزمِ سخن میں جی نہ لگا اپنا زینہار
شب انجمن میں حالیؔ جادو بیاں نہ تھا

خواجہ الطاف حسین حالیؔ

جس کو غصے میں لگاوٹ کی ادا یاد رہے
آج دل لے گا، اگر کل نہ لیا، یاد رہے

شوق بڑھتا گیا جوں جوں رُکے اس شوخ سے ہم
یہ سبق وہ ہے کہ بھولے سے سوا یاد رہے

ہم بھی آدابِ شریعت سے تھے آگاہ، مگر
نہ ہو برتاؤ میں جو رسم، وہ کیا یاد رہے

یاد آؤ گے بہت، لطف سمجھ کر کیجئے!
اس بھلائی کا ہے انجام بُرا، یاد رہے

شیخ! ایاں شرم گنہ، شوق بھلا دیتا ہے
توبہ ان کی ہے، جنھیں اپنی خطا یاد رہے

خضرؑ نے پاؤں اگر دشتِ فنا میں رکھا
بھول جائیں گے رہِ آبِ بقا، یاد رہے

چارہ گر! کار بہ اندازۂ تدبیر نہیں
کیجیوٴ ہمّت، اگر وقتِ دعا یاد رہے

ابھی جانا نہیں حالیؔ نے کہ کیا چیز ہیں وہ
حضرت اس لطف کا پائیں گے مزا، یاد رہے

خواجہ الطاف حسین حالیؔ

نہ ٹھیری جب کوئی تسکینِ دل کی شکل یاروں میں
تو آنکلے تڑپ کر ہم تمہارے بے قراروں میں
کسی کے عشق میں دردِ جگر سے دل یہ کہتا ہے
ادھر بھی آنکلنا، ہم بھی ہیں اُمیدواروں میں
وہ ماتم بزمِ شادی ہے، تمہاری جس میں شرکت ہو
وہ مرنا، زندگی ہے، تم جہاں ہو، سوگواروں میں
تعلّی سے یہ نفرت ہے کہ بعدِ مرگ خاک اپنی
اگر اٹھتی بھی ہے، جا بیٹھتی ہے خاکساروں میں
ہمارے دل نے ہم سے بیوفائی کر کے کیا پایا؟
وہاں بھی جا کے ٹھیرایا گیا بے اعتباروں میں
وہ کھینچوں گا جلالؔ آ ہیں کہ اسکی خاک اُڑا دیں گی
فلک نے ہمیں ڈالا ہے سمجھ کر خاکساروں میں

حکیم سید ضامن علی جلالؔ

ہنگامہ ہے کیوں برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے
ڈاکہ تو نہیں مارا چوری تو نہیں کی ہے

ناتجربہ کاری سے واعظ کی یہ باتیں ہیں
اس رنگ کو کیا جانے پوچھو تو کبھی پی ہے؟

اُس مے سے نہیں مطلب دل جس سے ہے بیگانہ
مقصود ہے اس مَے سے دل ہی میں جو کھنچتی ہے

اے شوق وہی مَے پی لے ہوش ذرا سو جا
مہمانِ نظر اس دم اِک برقِ تجلّی ہے

واں دل میں کہ صدمے دو، یاں جی میں کہ سب سہہ لو
ان کا بھی عجب دل ہے میرا بھی عجب جی ہے

ہر ذرّہ چمکتا ہے انوارِ الٰہی سے
ہر سانس یہ کہتی ہے ہم ہیں تو خدا بھی ہے

سورج میں لگے دھبّا فطرت کے کرشمے ہیں
بُت ہم کو کہیں کافر اللہ کی مرضی ہے

سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

معرفت خالق کی عالم میں بہت دشوار ہے
شہر تن میں جب کہ خود اپنا پتہ ملتا نہیں

کشتیٔ دل کی الٰہی بحرِ ہستی میں ہو خیر
ناخدا ملتے ہیں لیکن باخدا ملتا نہیں

زندگانی کا مزہ ملتا تھا جن کی بزم میں
ان کی قبروں کا بھی اب مجھ کو پتا ملتا نہیں

صرفِ ظاہر ہو گیا سرمایۂ زیب و صفا
کیا تعجب ہے جو باطن باصفا ملتا نہیں

پختہ طبعوں پر حوادث کا نہیں ہوتا اثر
کوہساروں میں نشانِ نقشِ پا ملتا نہیں

شیخ صاحب برہمن سے لاکھ برتیں دوستی
بے بھجن گائے تو مندر سے ٹکا ملتا نہیں

سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی

کچھ کہے جاتا تھا غرق اپنے ہی افسانے میں تھا
مرتے مرتے ہوش باقی تیرے دیوانے میں تھا

مسکرا کر جھانکتی تھی کس ادا سے اک پری
چہرۂ ساقی کا شاید عکس پیمانے میں تھا

ہائے وہ خود رفتگی الجھے ہوئے سب سر کے بال
وہ کسی میں اب کہاں جو تیرے دیوانے میں تھا

دیکھتا تھا جس طرف اپنا ہی جلوہ تھا عیاں
میں نہ تھا وحشی کوئی اس آئینہ خانے میں تھا

بوریا تھا، کچھ شبینہ مے تھی یا ٹوٹے سبو
اور کیا اس کے سوا مستوں کے ویرانے میں تھا

ہنستے ہنستے رو دیا کرتے تھے سب بے اختیار
اک نئی ترکیب کا درد اپنے افسانے میں تھا

شادؔ کچھ پوچھو نہ مجھ سے میرے دل کے داغ کو
ٹمٹماتا سا چراغ اک اپنے ویرانے میں تھا

سید علی محمد شادؔ عظیم آبادی

ڈھونڈوگے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں، نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم، اے ہم نفسو! وہ خواب ہیں ہم

اے درد! پتا کچھ تو ہی بتا، اب تک یہ معمہ حل نہ ہوا
ہم میں ہے دلِ بیتاب نہاں، یا آپ دلِ بیتاب ہیں ہم

میں حیرت و حسرت کا مارا، خاموش کھڑا ہوں ساحل پہ
دریائے محبت کہتا ہے کہ آ کچھ بھی نہیں، پایاب ہیں ہم

ہو جائے بکھیڑا پاک کہیں، پاس اپنے بلا لیں بہتر ہے!
اب دردِ جدائی سے ان کے اے آہ! بہت بیتاب ہیں ہم

لاکھوں ہی مسافر چلتے ہیں، منزل پہ پہنچتے ہیں دو ایک
اے اہلِ زمانہ! قدر کرو! نایاب نہ ہوں، کم یاب ہیں ہم

مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے
آجاؤ، جو تم کو آنا ہو، ایسے ہیں، ابھی شاداب ہیں ہم

سید علی محمد شاد عظیم آبادی

ایک ستم اور لاکھ ادائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے
ترچھی نگاہیں، تنگ قبائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

ہجر میں اپنا اور ہی عالم، ابرِ بہاراں دیدۂ پُرنم
ضد کہ ہمیں وہ آپ بلائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

اپنی ادا سے آپ کھٹکنا، اپنی ہوا سے آپ جھجکنا!
چال میں لغزش، منہ پہ حیائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

ہاتھ میں آڑی تیغ پکڑنا، تاکہ لگے بھی زخم تو اوچھا
قصد کہ پھر جی بھر کے ستائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

کالی گھٹائیں، باغ میں جھولے، دھانی دوپٹے، لٹ چھٹکائے
مجھ پہ یہ قدغن، آپ نہ آئیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

پچھلے پہر اُٹھ اُٹھ کے نمازیں ناک رگڑنی سجدے پہ سجدے
جو نہیں جائز اس کی دعائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

شاؔد نہ وہ دیدار پرستی، اور نہ وہ بے نشہ کی مستی
تجھ کو کہاں سے ڈھونڈ کے لائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

سید علی محمد شاؔد عظیم آبادی

ہنگامِ نزع، گریہ یہاں بے کسی کا تھا
تم ہنس پڑے، یہ کون سا موقع ہنسی کا تھا

دل نے مجھے خراب کیا، کوئے یار میں
دشمن پر اعتبار مجھے دوستی کا تھا

یہ اپنی وضع اور یہ دشنامِ مے فروش
سن کر جو پی گئے، یہ مزہ مفلسی کا تھا

وہ کیوں ٹھہرتے، نزع میں، بالینِ غیر پر
کوئی معاملہ یہ گھڑی دو گھڑی کا تھا

حسرت سے کوئی سوئے فلک دیکھتا تھا آج
لب پر گلہ کسی کا، نہ شکوا کسی کا تھا

اہلِ حرم بھی آکے ہوئے تھے شریکِ دور
کچھ اور رنگ آج مری مے کشی کا تھا

لوٹے مزے حیا کے، اٹھائے ادا کے لطف
پہروں سے آج مجھ کو، تصوّر کسی کا تھا

زاہد تمام عمر فرشتہ بنا رہا
اس نے کیا جو کام، یہ کام آدمی کا تھا

جس انجمن میں بیٹھ گیا، رونق آگئی
کچھ آدمی ریاضؔ عجب دل لگی کا تھا

ریاضؔ احمد ریاضؔ خیرآبادی

کس مست سے ساقی آنکھ لڑی متوالا بنا لہرا کے گرا
آگے تو ہیں راہیں اور کٹھن دل پہلے ہی ٹھوکر کھا کے گرا

دل شوق کے جوش میں دوڑ پڑا اور شوق تو ہوتا ہی اندھا
در بند پڑا تھا قسمت کا ٹکر جو لگی تیورا کے گرا

کیا عشق کی منزل بھی تھی کٹھن بندھ بندھ کر ہمت ٹوٹ گئی
جو ایک قدم چل کر سنبھلا وہ دو قدم آگے جا کے گرا

سُلگی ہوئی ہی غم کی بھٹی دل کیوں نہ پگھل کر ہو پانی
جو قطرہ آنسو بن کے بہا لہرا کے چلا تیورا کے گرا

جو نالہ فلک سے ٹکرایا وہ آرزو اک تارا ٹوٹا
دشمن کی طرف جو لپکا تھا وہ شعلہ مجھی پر آ کے گرا

سید انوار حسین آرزو لکھنوی

اوّلِ شب وہ بزم کی رونق شمع بھی تھی پروانہ بھی
رات کے آخر ہوتے ہوتے ختم تھا یہ افسانہ بھی

قید کو توڑ کے نِکلا جب میں اُٹھ کے بگولے ساتھ ہوئے
وسعتِ عدم تک جنگل جنگل بھاگ چلا ویرانہ بھی

ہاتھ سے کس نے ساغر پٹکا موسم کی بے کیفی پر
اتنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا میخانہ بھی

خون ہی کی شرکت وہ نہ کیوں ہو شرکت چیز ہے جھگڑے کی
اپنوں سے وہ دیکھ رہا ہوں جو نہ کرے بیگانہ بھی

ایک لگی کے دو ہیں اثر اور دونوں حسبِ مراتب ہیں
لو جو لگائے شمع کھڑی ہے رقص میں ہے پروانہ بھی

دونوں جولاں گاہِ جنوں ہیں بستی کیا ویرانہ کیا
اُٹھ کے چلا جب کوئی بگولا دوڑ پڑا دیوانہ بھی

وحدت میں کی کثرت پیدا جلووں کی پاشانی نے
ایک ہی جا تھا کچھ دن پہلے کعبہ بھی بتخانہ بھی

حسن و عشق کی لاگ میں اکثر چھیڑ ادھر سے ہوتی ہے
شمع کا شعلہ جب لہرایا اُڑ کے چلا پروانہ بھی

دورِ مسرت آرزو اپنا کیسا زلزلہ آگیں تھا
ہاتھ سے منہ تک آتے آتے چھوٹ پڑا پیمانہ بھی

سید انوار حسین آرزو لکھنوی

نہ پوچھو! کون ہیں، کیوں راہ میں ناچار بیٹھے ہیں
مسافر ہیں، سفر کرنے کی ہمت ہار بیٹھے ہیں

اُدھر پہلو سے تم اُٹھے، اِدھر دنیا سے ہم اُٹھے
چلو، ہم بھی تمھارے ساتھ ہی تیار بیٹھے ہیں

کِسے فرصت؟ کہ فرضِ خدمتِ اُلفت بجا لائے
نہ تم بے کار بیٹھے ہو، نہ ہم بے کار بیٹھے ہیں

جو اُٹھے ہیں، تو گرم جستجوئے دوست اُٹھے ہیں
جو بیٹھے ہیں، تو محوِ آرزوئے یار بیٹھے ہیں

مقامِ دستگیری ہے کہ تیرے رہروِ اُلفت
ہزاروں جستجوئیں کر کے ہمت ہار بیٹھے ہیں

نہ پوچھو، کون ہیں، کیا مدعا ہے، کچھ نہیں بابا!
گدا ہیں اور زیرِ سایۂ دیوار بیٹھے ہیں

یہ ہو سکتا نہیں، آزاد سے مے خانہ خالی ہو
وہ دیکھو! کون بیٹھا ہے، وہی سرکار بیٹھے ہیں

حکیم الطاف احمد آزاد انصاری

فنا کا ہوش آنا، زندگی کا دردِ سر جانا
اجل کیا ہے خمارِ بادۂ ہستی اُتر جانا

مقام کوچ کیا ہے منزلِ مقصود تک بھولے
قیامت تھا سرائے دہر میں دو دن ٹھہر جانا

بہت سودا رہا واعظ تجھے نارِ جہنّم کا
مزا سوزِ محبّت کا بھی کچھ اے بے خبر جانا

مصیبت میں بشر کے جوہرِ مردانہ کھلتے ہیں
مبارک بزدلوں کو گردشِ قسمت سے ڈر جانا

سدھاری منزلِ ہستی سے کس بے اعتنائی سے
تنِ خاکی کو شاید روح نے گردِ سفر جانا

برج نرائن چکبست

یہ آہِ بے اثر کیا ہو، یہ نخلِ بے ثمر کیا ہو!
نہ ہو جب دردہی یارب! تو دل کیا ہو، جگر کیا ہو
بغل گیر آرزو سے ہیں مُرادیں، آرزو مجھ سے
یہاں اس وقت تو اک عید ہے تم جلوہ گر کیا ہو
مقدر میں یہ لکھا ہے: کٹے گی عمر مر مر کر
ابھی سے مرگئے ہم، دیکھئے اب عمر بھر کیا ہو
مروّت سے ہو بیگانہ، وفا سے دور ہو کوسوں
یہ سچ ہے، نازنیں ہو، خوبصورت ہو، مگر کیا ہو
لگا کر زخم میں ٹانکے قضا تیری نہ آجائے
جو وہ سفاک سن پائے بتا اے چارہ گر! کیا ہو؟
قیامت کے بکھیڑے پڑگئے آتے ہی دنیا میں
یہ مانا ہم نے مرجانا تو ممکن ہے مگر کیا ہو
کہا میں نے کہ نظمؔ مبتلا مرتا ہے حسرت میں
کہا اس نے اگر مرجائے تو میرا ضرر کیا ہو
سید علی حیدر نظمؔ طبا طبائیؒ

مدتیں ہو گئی ہیں چپ رہتے
کوئی سنتا تو ہم بھی کچھ کہتے

جل گیا خشک ہو کے دامن دل
اشک آنکھوں سے دور گیا بہتے

بات کی اور منہ کو آیا جگر
اس سے بہتر یہی تھا چپ رہتے

ہم کو جلدی نے موت کی مارا
اور جیتے تو اور غم سہتے

سب ہی سنتے تمہاری اے محشرؔ
کوئی کہنے کی بات اگر کہتے

مرزا کاظم حسین محشرؔ

تیس دن کے لئے ترکِ مے و ساقی کر لوں
واعظِ سادہ کو روزوں میں تو راضی کر لوں

پھینک دینے کی کوئی چیز نہیں فضل و کمال
ورنہ حاسد! تری خاطر سے میں یہ بھی کر لوں

اے نکیرین! قیامت ہی پہ رکھو پرسش
میں ذرا عمرِ گذشتہ کی تلافی کر لوں

کچھ تو ہو چارۂ غم، بات تو یک سو ہو جائے
تم خفا ہو، تو اجل ہی کو میں راضی کر لوں

اور پھر کس کو پسند آئے گا ویرانۂ دل
غم سے مانا بھی کہ اس گھر کو میں خالی کر لوں

دل ہی ملتا نہیں سفلوں سے وگرنہ شبلی
خوب گزرے فلکِ دوں سے جو یاری کر لوں

مولوی محمد شبلی نعمانی

وہ سن کر حور کی تعریف، پردے سے نکل آئے
کہا! پھر مسکرا کر حسنِ زیبا اس کو کہتے ہیں

اجل کا نام دشمن دوسرے معنی میں لیتا ہے
تمہارے چاہنے والے تمنّا اس کو کہتے ہیں

مرے مدفن پہ کیوں روتے ہو، عاشق مر نہیں سکتا
یہ مر جانا نہیں ہے، صبر آنا اس کو کہتے ہیں

نمک بھر کر مرے زخموں میں تم کیا مسکراتے ہو
مرے زخموں کو دیکھو، مسکرانا اس کو کہتے ہیں

زمانے سے عداوت کا سبب تھی دوستی جن کی
اب ان کو دشمنی ہے ہم سے، دنیا اس کو کہتے ہیں

دکھاتے ہم نہ آئینہ تو یہ کیوں کر نظر آتا
بشر حوروں سے اچھا تم نے دیکھا اس کو کہتے ہیں

سید وحید الدین بیخود دہلوی

سنا بھی کبھی ماجرا درد و غم کا کسی دل جلے کی زبانی کہو تو
نکل آئیں آنسو، کلیجہ پکڑ لو، کروں عرض اپنی کہانی کہو تو

تمہیں رنگِ مے شیخ مرغوب کیا ہے، گلابی ہو یا زعفرانی کہو تو
پلائے کوئی ساقیٔ حور پیکر، مصفّا، کشیدہ، پرانی کہو تو

تمنّائے دیدار ہے حسرتِ دل کہ تم جلوہ فرما ہو میں آنکھیں سیکوں
نہ کہہ دینا موسیٰ سے جیسے کہا تھا، مری عرض پر لن ترانی کہو تو

وفا پیشہ عاشق نہیں دیکھا تم نے، مجھے دیکھ لو، جانچ لو، آزما لو
تمہارے اشارے پہ قربان کر دوں ابھی مایۂ زندگانی کہو تو

کہاں میں کہاں داستاں کا تقاضا مرے ضبطِ دردِ نہاں کا ہے کستا
پھر اس پر یہ تاکید بھی ہے برابر، نہ کہنا پرانی کہانی کہو تو

مرے نامۂ شوق کی سطر میں ہے جگہ اک جو سادہ وہ مہمل نہیں ہے
میں سمجھاؤں خدمت میں حاضر ابھی خود بتانے کو اسکے معانی کہو تو

نواب سراج الدین احمد سائل دہلوی

کہاں تک جفا حسن والوں کی سہتے
جوانی جو رہتی تو پھر ہم نہ رہتے
وفا بھی نہ ہوتا تو اچھا تھا وعدہ
گھڑی دو گھڑی تو کبھی شاد رہتے
نشیمن نہ جلتا نشانی تو رہتی
ہمارا تھا کیا ٹھیک رہتے نہ رہتے
بتاتے ہیں آنسو کہ اب دل نہیں ہے
جو پانی نہ ہوتا تو دریا نہ بہتے
زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا....
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے
کوئی نقش اور کوئی دیوار سمجھا
زمانہ ہوا مجھ کو چپ رہتے رہتے
مری ناؤ اس غم کے دریا میں ثاقب
کنارے پہ آ ہی لگی بہتے بہتے

ذاکر حسین ثاقب لکھنوی

وہ عالم ہے کہ منہ پھیرے ہوئے عالم نکلتا ہے
شب فرقت کے غم جھیلے ہوؤں کا دم نکلتا ہے

الٰہی خیر ہو الجھن پہ الجھن بڑھتی جاتی ہے
نہ میرا دم نہ اُن کے گیسوؤں کا خم نکلتا ہے

قیامت ہی نہ ہو جائے جو پردے سے نکل آؤ
تمہارے منہ چھپانے میں تو یہ عالم نکلتا ہے

شکستِ رنگِ رُخ آئینہ بے تابیِ دل ہے
ذرا دیکھو تو کیوں کر غمزدوں کا دم نکلتا ہے

نگاہِ التفاتِ مہر اور اندازِ دلجوئی
مگر اک پہلوئے بے تابیِ شبنم نکلتا ہے

صفی کشتہ ہوں نا پُرسانیوں کا اہلِ عالم کی
یہ دیکھوں کون میرا صاحبِ ماتم نکلتا ہے

سید علی نقی صفی لکھنوی

کیا بتاؤں دل کہاں ہے اور کس جا درد ہے
میں سراپا دل ہوں، دل میرا سراپا درد ہے

یہ سمجھ لیں پہلے آپ اے حضرتِ عیسیٰ! ذرا
کس کے دل میں درد ہے یہ اور کس کا درد ہے

جو چلا دنیا سے، وہ رکھے ہوئے سینے پہ ہاتھ
میں سمجھتا ہوں کہ سب کے دل میں تیرا درد ہے

میرے چپ رہنے سے تو غافل ہی ادظاہر پرست
ظرف بھی اتنا ہی میں رکھتا ہوں، جتنا درد ہے

ہر تڑپ پر قالبِ مُردہ میں آجاتی ہے رُوح
مجھ مریضِ ناتواں کی جان گویا درد ہے

بچ گئے تو انتہائے عشق میں لُطف آئے گا
اور ابھی تو ابتدا میں انتہا کا درد ہے

اپنا اپنا حال کہہ لینے دو ناطق سب کو تم
جانتا ہے وہ کہ کس کے دل میں کتنا درد ہے

حکیم سعید احمد ناطق لکھنوی

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا — وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا

اُف مرے اجڑے ہوئے گھر کی تباہی دیکھو — جس کے ہر ذرّہ پہ چھایا ہے بیاباں ہونا

حادثے دونوں یہ عالم میں اہم گذرے ہیں — میرا مرنا، تیری زلفوں کا پریشاں ہونا

کچھ نہ پوچھو شبِ وعدہ مرے گھر کی رونق — اللہ اللہ وہ سامان سے ساماں ہونا

جوش میں لیکے اک انگڑائی کسی کا کہنا — تم کو آتا ہی نہیں چاک گریباں ہونا

سرخ ڈورے تری آنکھوں کے الٰہی توبہ — چاہیے تھا انہیں پیوستِ رگِ جاں ہونا

ہو چلیں آپ کے بیمار کی آنکھیں بے نور — قہر تھا صبح کے تارے کا نمایاں ہونا

میں کروں دل ضبط ادھر ان کو پسینہ آئے — چاہیے یوں غمِ پنہاں کو نمایاں ہونا

اللہ اللہ یہ سلیقہ ترا اے شعلۂ طور! — کس طرح تو نے چھپایا ہے نمایاں ہونا

اُن سے کرتا ہے دمِ نزع وصیت یہ عزیزؔ
خلق روئے گی، مگر تم نہ پریشاں ہونا

مرزا محمد ہادی عزیزؔ

ادائیں بانکپن، انداز میں اک آن پیدا کر
تجھے معشوق بننا ہے، تو پوری شان پیدا کر

کہاں کا وصل، کیسی آرزو، اے دل! وہ کہتے ہیں
نہ میں حسرت کروں پوری، نہ تو ارمان پیدا کر

ہمارا انتخاب اچھا نہیں اے دل! تو پھر تو ہی
خیالِ یار سے بہتر کوئی مہمان پیدا کر

مجھے ہے رشک اس کو بھی رقیب اپنا سمجھتا ہوں
نہ دیکھے جو تجھے ایسا کوئی دربان پیدا کر

خیالِ ضبطِ الفت ہے تو احسن خوف پھر کیسا
نہ دھڑکے دل بھی سینے میں وہ اطمینان پیدا کر

حافظ علی اختر احسن مارہروی

آپ جن کے قریب ہوتے ہیں
وہ بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں

جب طبیعت کسی پر آتی ہے
موت کے دن قریب ہوتے ہیں

مجھ سے ملنا، پھر آپ کا ملنا
آپ کس کو نصیب ہوتے ہیں

ظلم سہہ کر، جو اُف نہیں کرتے
ان کے دل بھی عجیب ہوتے ہیں

عشق میں اور کچھ نہیں ملتا
سینکڑوں غم نصیب ہوتے ہیں

نوح کی قدر کوئی کیا جانے
کہیں ایسے ادیب ہوتے ہیں

محمد نوح ناروی

عشق ہی عشق ہو، عاشق ہو نہ معشوق جہاں
ایسی اک درگہِ توحید مآب اور بھی ہے

ہوش سے کاٹے یہ دن، زندہ دلی سے رکھو کام
شیب کے بعد مری جان! شباب اور بھی ہے

یارے خلانے اگر کر گئے خالی، غم کیا؟
اب بھی ابر آتا ہے اور خم میں شراب اور بھی ہے

گھر کیا غالبؔ و مومنؔ نے جہاں آنکھوں میں
اسی بستی میں کوئی خانہ خراب اور بھی ہے

برج موہن دتاتریہ کیفیؔ

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں

ہر آن تسلّی ہے، ہر لحظہ تشفی ہے
ہر وقت ہے دلجوئی ہر دم ہیں مداراتیں

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

بیٹھا ہوا توبہ کی تُو خیر منایا کر
ٹلتی نہیں یُوں جوہر اس دیس کی برساتیں

مولانا محمد علی جوہر

پھر اعتبارِ عشق کے قابل نہیں رہا
جو دل تری نظر سے گرا دل نہیں رہا

نشتر چبھوئے اب نہ پشیمانیٔ نگاہ
مجھ کو تو شکوۂ خلشِ دل نہیں رہا

موجیں اُبھار کر مجھے جس سمت لے چلیں
حدِ نگاہ تک کہیں ساحل نہیں رہا

کیا کہیئے اب مآلِ محبّت کی سرگذشت
یاد اس کی رہ گئی ہے مگر دل نہیں رہا

سید ضمیر حسین دلؔ شاہجہانپوری

یاد میں تیری جہاں کو بھولتا جاتا ہوں میں
بھولنے والے! کبھی تجھ کو بھی یاد آتا ہوں میں

ایک دھندلا سا تصور ہے کہ دل بھی تھا یہاں
اب تو سینے میں فقط اک ٹیس سی پاتا ہوں میں

او وفا نا آشنا کب تک سنوں تیرا گلہ
بے وفا کہتے ہیں تجھ کو اور شرماتا ہوں میں

آرزوؤں کا شباب اور مرگِ حسرت ہائے ہائے
جب بہار آئی گلستاں میں تو مرجھاتا ہوں میں

حشر میری شعر گوئی ہے فقط فریادِ شوق!
اپنا غم دل کی زباں میں دل کو سمجھاتا ہوں میں

آغا محمد شاہ حشر کاشمیری

کبھی اے حقیقتِ منتظر، نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

طرب آشنائے خروش ہو، تو نوا ہے، محرمِ گوش ہو
وہ سرود کیا، کہ چھپا ہوا ہو، سکوتِ پردۂ ساز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو، تو عزیز تر ہے، نگاہِ آئینہ ساز میں

دمِ طوف، کرمکِ شمع نے یہ کہا کہ وہ اثرِ کہن
نہ تری حکایتِ سوز میں، نہ مری حدیثِ گداز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی، تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو، ترے عفوِ بندہ نواز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی، تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں

ڈاکٹر محمد اقبال

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

تمہارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار! کیا تھی

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

تأمل تو تھا ان کو آنے میں قاصد!
مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی

کہیں ذکر رہتا ہے اقبالؔ تیرا
فسوں تھا کوئی، تیری گفتار کیا تھی

ڈاکٹر محمد اقبالؔ

وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں
آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

بے زبانی ترجمانِ شوق بے حد ہو تو ہو
ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں

مٹ رہی ہیں دل سے یادیں روزگارِ عشق کی
اب نظر کاہے کو آئیں گی یہ تصویریں کہیں!

التفاتِ یار تھا اک خوابِ آغازِ وفا
سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں

تیری بے صبری ہے حسرتؔ خامکاری کی دلیل
گریۂ عشاق میں ہوتی ہیں تاثیریں کہیں

سید فیض الحسن حسرتؔ موہانی

بھلاتا لاکھ ہوں، لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی! ترکِ اُلفت پر وہ کیوں کر یاد آتے ہیں

نہ چھیڑ اے ہم نشیں! کیفیتِ صہبا کے افسانے
شرابِ بے خودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں

رہا کرتے ہیں قیدِ ہوش میں اے وائے ناکامی
وہ دشتِ خود فراموشی کے چکر یاد آتے ہیں

نہیں آتی، تو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں، تو اکثر یاد آتے ہیں

حقیقت کھل گئی حسرتؔ ترے ترکِ محبت کی
تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں

سیّد فیض الحسن حسرتؔ موہانی

چادر جو کہیں حسنِ رُخِ یار کی سر کی

قابو میں طبیعت نہ رہی ذوقِ نظر کی

سوتے میں جو دیکھا تھا رُخِ یار کا عالم

آنکھوں میں یہ خُنکی ہے اُسی نورِ سحر کی

ہے شوق بھی گر دیدہ تیرے نقشِ قدم کا

مائل ہے عقیدت بھی ترے سجدۂ در کی

چاہا تھا کہ پھر ان کو نہ چھیڑیں گے پہ چھیڑا

خواہش کوئی پھر اُن سے نہ کرنی تھی مگر کی

آجاتی ہے ناگاہ جدائی کی مصیبت

ہوتی ہے خبر کس کو ترے عزمِ سفر کی

یا حسن ہے یا عشق ہر اک نقش یہاں کا

کیا بات ہے اے شوخ تیرے راہگذر کی

کچھ فائدہ حسرت نہ ہوا ضبطِ ہوس کا

پوشیدہ محبت نہ رہی "ش" بسر کی

سید فیض الحسن حسرت موہانی

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا، اسے غمِ جاناں بنا دیا

یوں مسکرائے، جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

اے شیخ! وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی
کچھ قید و رسم نے جسے ایماں بنا دیا

کچھ آگ دی ہوس میں تو تعمیرِ عشق کی
جب خاک کر دیا اُسے عرفاں بنا دیا

اک برق تھی ضمیر میں فطرت کے موجزن
آج اس کو حسن و عشق کا ساماں بنا دیا

بلبل بہ آہ و نالہ و گُل مست رنگ و بُو
مجھ کو شہیدِ رسمِ گلستاں بنا دیا

کہتے ہیں: اک فریبِ مسلسل ہے زندگی
اس کو بھی وقفِ حسرت و حرماں بنا دیا

اس حسن کاروبار کو مستوں سے پوچھیے
جس کو فریبِ ہوش نے عصیاں بنا دیا

سید اصغر حسین اصغر گونڈوی

شوق سے ناکامی کی بدولت کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا
ساری اُمیدیں ٹوٹ گئیں، دل بیٹھ گیا، جی چھوٹ گیا

فصلِ گُل آئی، یا اجل آئی، کیوں درِ زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آ پہنچا، یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

لیجیے کیا دامن کی خبر اور دستِ جنوں کو کیا کہیے!
اپنے ہی ہاتھ سے دل کا دامن مدّت گزری چھوٹ گیا

منزلِ عشق پہ تنہا پہنچے، کوئی تمنّا ساتھ نہ تھی!
تھک تھک کر اس راہ میں آخر ایک اک ساتھی چھوٹ گیا

فانیؔ ہم تو جیتے جی وہ میّت ہیں بے گور و کفن!
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

شوکت علی خاں فانیؔ بدایونی

دنیا میری بلا جانے، مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

آبادی بھی دیکھی ہے، ویرانے بھی دیکھے ہیں
جو اُجڑے اور پھر نہ بسے، دل وہ نرالی بستی ہے

عجزِ گناہ کے دم تک ہیں، عصمتِ کامل کے جلوے
پستی ہے تو بلندی ہے، رازِ بلندی پستی ہے

جان سی شے بک جاتی ہے ایک نظر کے بدلے میں!
آگے مرضی گاہک کی، ان داموں تو سستی ہے

وحشتِ دل سے پھرنا ہے، اپنے خدا سے پھر جانا
دیوانے یہ ہوش نہیں، یہ تو ہوش پرستی ہے

جگ سونا ہے تیرے بغیر، آنکھوں کا کیا حال ہوا
جب بھی دنیا بستی تھی، اب بھی دنیا بستی ہے

آنسو تھے سو خشک ہوئے، جی ہے کہ اُمڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے، کھلتی ہے نہ برستی ہے

دل کا اُجڑنا سہل سہی، بسنا سہل نہیں ظالم!
بستی بسنا کھیل نہیں، بستے بستے بستی ہے

فانی جس میں آنسو کیا، دل کے لہو کا کال نہ تھا
ہائے! وہ آنکھ اب پانی کی دو بوندوں کو ترستی ہے

شوکت علی خاں فانی

دنیا کے ستم یاد، نہ اپنی ہی وفا یاد
اب مجھ کو نہیں کچھ بھی محبت کے سوا یاد

کیا لطف کہ میں اپنا پتہ آپ بتاؤں
کیجے کوئی بھولی ہوئی خاص اپنی ادا یاد

میں ترکِ رہ و رسمِ جنوں کر ہی چکا تھا
کیوں آ گئی ایسے میں تری لغزشِ پا یاد

کیا جانیے، کیا ہو گیا اربابِ جنوں کو
جینے کی ادا یاد، نہ مرنے کی ادا یاد

مدت ہوئی اک حادثۂ عشق کو لیکن
اب تک ہے ترے دل کے دھڑکنے کی صدا یاد

علی سکندر جگر مراد آبادی

وہ مجسّم مری نگاہ میں ہے
اک جھلک جس کی مہر و ماہ میں ہے

کیا کشش حسنِ بے پناہ میں ہے
جو قدم ہے اسی کی راہ میں ہے

میکدے میں نہ خانقاہ میں ہے
میری جنت تری نگاہ میں ہے

ہائے وہ رازِ غم کہ جو اب تک
مرے دل میں تری نگاہ میں ہے

ڈگمگانے لگے ہیں پائے طلب
دل ابھی ابتدائے راہ میں ہے

عشق میں کیسی منزلِ مقصود
وہ بھی اک گرد ہے جو راہ میں ہے

میرے پندارِ عشق پر مت جا
یہ ادا نازِ گاہ گاہ میں ہے

نقشِ حیرت ہے آج حسن بھی خود
کون یہ عشق کی نگاہ میں ہے

مستیٔ چشمِ یار کیا کہیے
مے تو کیا میکدہ نگاہ میں ہے

اللہ اللہ اتحادِ مذاق
عالمِ دل بھی اب نگاہ میں ہے

حسن کو بھی کہاں نصیب جگر
وہ جو اک شے مری نگاہ میں ہے

علی سکندر جگر مراد آبادی

رُکنے لگی ہے نبضِ رفتارِ جاں نثاراں
کب تک یہ تند گامی اے میرِ شہسواراں

اٹھلا رہے ہیں جھونکے بوچھار آ رہی ہے
ایسے میں تو بھی آجا اے جانِ جاں نثاراں

کب سے مچل رہی ہے اِس زلفِ خم بہ خم میں
تعبیرِ خوابِ سُنبل تفسیرِ بادو باراں

خوبانِ شہر کیا کیا اترا کے چل رہے ہیں
آ بوستاں میں ور آ۔ لے فاتحِ نگاراں

آنکھیں ہیں زخم خوردہ، دل ہے خزاں گزیدہ
تکلیفِ یک تبسّم اے دولتِ بہاراں

ہاں جوشؔ کا ادب کر یہ رندِ بادہ کش ہے
سردارِ نکتہ سنجاں، سرخیلِ پختہ کاراں

شبیر حسن جوشؔ ملیح آبادی

ملا جو موقع تو روک دوں گا جلالِ روزِ حساب تیرا
پڑھوں گا رحمت کا وہ قصیدہ کہ ہنس پڑے گا عتاب تیرا

یہی تو ہیں دو ستونِ محکم، انہیں پہ قائم ہے نظمِ عالم
یہی تو ہے رازِ خلدِ آدم، نگاہ میری شباب تیرا

صبا تصدق ترے نفس پر، چمن ترے پیرہن پہ قرباں
شمیمِ دوشیزگی میں کیسا بسا ہوا ہے شباب تیرا

تمام محفل کے روبرو گو، اٹھائیں نظریں ملائیں آنکھیں
سمجھ سکا ایک بھی نہ لیکن، سوال میرا جواب تیرا

ہزار شاخیں ادا سے لچکیں، ہوا نہ تیرا سا اوچ پیدا
شفق نے کتنے ہی رنگ بدلے، ملا نہ رنگِ شباب تیرا

اِدھر مرا دل تڑپ رہا ہے، تری جوانی کی جستجو میں
اُدھر مرے دل کی آرزو میں مچل رہا ہے شباب تیرا

کرے گی دونوں کا چاک پردہ، رہے گا دونوں کو کر کے رسوا
یہ شورشِ ذوقِ دید میری یہ اہتمامِ حجاب تیرا

جڑیں پہاڑوں کی ٹوٹ جاتیں، فلک تو کیا عرش کانپ اٹھتا
اگر میں دل پر نہ روک لیتا، تمام زورِ شباب تیرا

بھلا ہوا جوشؔ نے اٹھایا نگاہ کا چشمِ تر سے پردہ
بلا سے جاتی رہیں گر آنکھیں کھلا تو بندِ نقاب تیرا

شبیر حسن جوشؔ ملیح آبادی

سیاروں کی تقدیر یہیں جاگ رہی ہے
سوتے ہیں نہ افلاک زمیں جاگ رہی ہے

تارے بھی ہیں بیدار زمیں جاگ رہی ہے
پچھلے کو بھی وہ آنکھ کہیں جاگ رہی ہے

اک عالمِ نیرنگ ہے دنیائے محبت
سوتی ہے کہیں اور کہیں جاگ رہی ہے

ہیں خواب میں عشاق مگر یاد کسی کی
یا دل ہی میں یا دل کے قریں جاگ رہی ہے

کروٹ سے شبِ ماہ میں بہتی ہے یہ گنگا
یا حسن کی بل کھائی جبیں جاگ رہی ہے

اقرار کی ٹھنڈک میں ہے انکار کی گرمی
سائے میں تری "ہاں" کے "نہیں" جاگ رہی ہے

آہوں سے گھو رات کا دل چیرتی جائیں
تاثیر سرِ عرشِ بریں جاگ رہی ہے

رگھوپتی سہائے فراق

مبارک رہے تم کو خوابوں کی دنیا
مجھے چاہیے اضطرابوں کی دنیا

تمناؤں میں دلکشی ہے تو، لیکن
سمجھ ان کو نازک حبابوں کی دنیا

نیا آسماں ہے، ستارے نئے ہیں
کبھی دیکھ تو ہم خرابوں کی دنیا

بہارِ مجسم خراماں گل افشاں
ارے توبہ مہکے شبابوں کی دنیا

ستارے چُرا لائے یارب کہاں سے
کسی ماہ پیکر کے خوابوں کی دنیا

کوئی حل کرے کیا معمائے ہستی
حجابوں کے اندر حجابوں کی دنیا

تکلم سے بڑھ کر خموشی نے لوٹی
محبت کے خاطر جوابوں کی دنیا

فقط دیدۂ پاک بیں کے لئے ہے
محبت کے معصوم خوابوں کی دنیا

ہوئی اپنے ہی خون میں غرق آخر
تعیش کی دنیا، شرابوں کی دنیا

جو پائندہ ہو گی محبت سے ہو گی
یہ دنیا کہ ہے اضطرابوں کی دنیا

اثر شورِ زاغ و زغن سے ہے بالا
بلند آشیانہ عقابوں کی دنیا

مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی

جب تک خلشِ دردِ خداداد رہے گی
دنیا دلِ ناشاد کی آباد رہے گی

دنیا کی ہوا راس نہ آئے گی کسی کو
ہر سر میں ہوائے عدم آباد رہے گی

چونکائے گی رہ رہ کے تو غفلت کا مزا کیا
ساتھ اپنے اجل صورتِ ہمزاد رہے گی

دل اور دھڑکتا ہے ادب گاہِ قفس میں
شاید یہ زباں تشنۂ فریاد رہے گی

جو خاک کا پُتلا وہی صحرا کا بگولا
مٹنے پہ بھی اک ہستیٔ برباد رہے گی

ہر شام ہوئی صبح کو اک خوابِ فراموش
دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

شہرہ ہے یگانہ تری بیگانہ روی کا
واللہ یہ بیگانہ روی یاد رہے گی

سید واحد حسین یگانہ

جتنے ستم کیے تھے کسی نے عتاب میں
وہ بھی مِلا لیے کرمِ بے حساب میں

حسرت کو گھر کہیں نہ ملا اضطراب میں
لٹنے کو آ گئی دلِ خانہ خراب میں

اٹھا ہے ابرِ سے کدہ دستِ دعا کے ساتھ
اتنی برس پڑے کہ نہا لوں شراب میں

آ، اے گلِ فسردہ! لگا لوں تجھے گلے
تو بھی تو میری طرح لٹا ہے شباب میں

ہر چیز پہ بہار، ہر اک شے پہ حسن تھا
دنیا جوان تھی مرے عہدِ شباب میں

سید عاشق حسین سیماب

نامہ گیا کوئی، نہ کوئی نامہ بر گیا
تیری خبر نہ آئی، زمانہ گزر گیا

ہنستا ہوں یوں کہ ہجر کی راتیں گزر گئیں
روتا ہوں یوں کہ لطفِ دعائے سحر گیا

اب مجھ کو ہے قرار، تو سب کو قرار ہے
دل کیا ٹھہر گیا کہ زمانہ ٹھہر گیا

یارب! نہیں میں واقفِ رودادِ زندگی
اتنا ہی یاد ہے کہ جیا اور مر گیا

سید عاشق حسین سیماب

مرے مذاقِ سخن کو سخن کی تاب نہیں — سخن ہے نالۂ دل نغمۂ رباب نہیں

اگر وہ فتنہ کوئی فتنۂ شباب نہیں — تو حشر میرے لئے وجہِ اضطراب نہیں

نہیں شراب کی پابند زندگی میری — یہ اک نشہ ہے جو آلودۂ شراب نہیں

مجھے ذلیل نہ کر عذرِ لن ترانی سے — یہ اہلِ ذوق کی توہین ہے جواب نہیں

جو کامیابِ محبت ہو سامنے آئے — میں کامیاب نہیں، ہاں میں کامیاب نہیں

قفس میں زمزمہ پیرا ہے روحِ آزادی — صدائے مرغِ نفس ہے نفیرِ خواب نہیں

اُسی کی شرم ہے میری نگاہ کا پردہ — وہ بے حجاب سہی، میں تو بے حجاب نہیں

سُنا ہے میں نے بھی ذکرِ بہشت و حور و طہور — خدا کا شکر کہ نیت میری خراب نہیں

سخنورانِ وطن سب ہیں آفتابِ کمال — تو کیوں کہوں کہ میں ذرہ ہوں آفتاب نہیں

بیانِ درد کو دل چاہیئے جنابِ حفیظ
فقط زبان یہاں قابلِ خطاب نہیں

عبدالحفیظ حفیظ جالندھری

تصوّر میں میرے اگر تم نہ ہوتے
گذر جاتی عمرِ رواں روتے روتے

یہ موسم سہانا فضا بھیگی بھیگی
بڑا لطف آتا اگر تم بھی ہوتے

جدائی کا عالم کوئی اس سے پوچھے
سحر ہو گئی ہو جسے روتے روتے

جُدائی میں شورش اگر آہ بھرتا
یقیناً فلک پر ستارے بھی روتے

شورش کاشمیری

یہ لُٹی ہوئی سی بہار کیوں ہے، کہاں وہ جانِ بہار ہے
یہ چمن سے کون چلا گیا کہ کلی کلی کو فشار ہے

تجھے مرحبا کہ دلِ فگار بہ حالِ زار و نزار ہے
ترے دردِ عشق کو آفریں مری زندگی مجھے بار ہے

یہ انیسِ غمکدۂ قفس، ہے عزیز جاں مجھے ہم نفس
دلِ داغدار غمِ بہار ہیں، یادگارِ بہار ہے

تمہیں جانِ فردِ بنا کے جس نے جہاں فروز بنا دیا
وہ فروغِ بزمِ جمال کون ہے؟ عشق نادرہ کار ہے

ترے باغ میں ہے بہار؟ تجکو مبارک اے مرے باغباں
جو کھبا ہے میری نظر میں پھول، وہ انتخابِ بہار ہے

غمِ آشیاں، مرے بال و پر کے قفس کو پھونکنا ہے کہیں
یہ نویدِ مرگ ہے ہم قفس کہ چمن میں جوشِ بہار ہے

میں بہارِ عمر کو سوگوارِ بہار بن کے گزار دوں؟
تری یہ رضا ہے، تو اس رضا پہ بہارِ عمر نثار ہے

نہیں اس میں شک کوئی تاجور کہ تڑپ ہی تیرے کلام میں
مگر اس میں تیرا کمال کیا؟ غمِ دوست درد نگار ہے

تاجور نجیب آبادی

زمانے سے مہر و وفا چاہتا ہوں
ذرا دیکھنا کس سے کیا چاہتا ہوں

سُنے دل سے، دل کی کہوں جس سے باتیں
وہ مونسِ وہ دردآشنا چاہتا ہوں

نہیں شوخ چشمی یہ جوشِ فنا ہے
کہ تجھ سے تجھے اے خدا چاہتا ہوں

یہ حُسنِ طلب بھی ہے کیا لذّت آئیں
جو کوئی نہیں چاہتا، چاہتا ہوں

منوّر منوّر درخشاں درخشاں
دل و دیدہ طور آشنا چاہتا ہوں

ہر اک شے میں حسن ازل گو ہے پنہاں
اُسی جلوہ کو برملا چاہتا ہوں

کہیں میں کہیں دل تو پھر کون جانے
وہ کیا چاہتا ہے میں کیا چاہتا ہوں

خودی جذب ہونے کو ہے بیخودی میں
کہ اپنے ہی میں گُم ہوا چاہتا ہوں

میرے ذوق میں ہے لطافت پسندی
نہیں حُسن، حُسنِ ادا چاہتا ہوں

زباں سے زمانے کی بچنے کو کیفیؔ
میں اِک کفر ایماں نما چاہتا ہوں

کیفیؔ دہلوی

جوشؔ ملسیانی

دل پہ جو گزری کوئی کیا جانے
یہ تو ہم جانیں یا خدا جانے

خاک جھیلے گا وہ مصیبتِ عشق
جو لگا کر نہ پھر بجھا جانے

تو ہی اپنا مقام جانتا ہے
اک ظلوم و جہول کیا جانے

کیا کرے عرضِ مدعا وہ بشر
ابتدا کو جو انتہا جانے

دل کو کل تک تو چین حاصل تھا
آج کیا ہو گیا خدا جانے

بادہ نوشوں کا حشر کیا ہوگا
مجھ بلا نوش کی بلا جانے

بات رندی کی مجھ کو آتی ہے
پارسائی کی پارسا جانے

تجھ کو اپنی خبر نہیں اے جوشؔ
تو خدائی کے راز کیا جانے

جوشؔ ملسیانی

جھگڑا ہی چکا، میں بھی چلا، دردِ جگر بھی
اب کیا ہے اگر ہو شبِ فرقت کی سحر بھی

جاں بر نہ ہوا میں، یہ جُدا بات ہے ورنہ
ظاہر ہے کہ ہر شام کی ہوتی ہے سحر بھی

دیکھے گی کسے ان کے سوا یہ نگہِ شوق
مالک ہے جو دل کا وہ ہے مختارِ نظر بھی

کیا عرض کروں منتظرِ جلوہ کی حالت
دیکھی ہے کبھی آپ نے تصویرِ نظر بھی

یارا کسے یک جنبشِ ابرو کا ہے مانیؔ
کافی ہے تباہی کے لئے نیم نظر بھی

سیّد کلب احمد مانیؔ جائسی

کوئی ادا شناسِ محبت، ہمیں بتائے
جو ہم کو بھول جائے، وہ کیوں ہم کو یاد آئے

کس کی مجال تھی کہ حجابِ نظر اٹھائے
وہ مسکرا کے آپ ہی دل کے قریب آئے

اک دل نشیں نگاہ میں اللہ یہ خلش
نشتر کی نوک جیسے کلیجے میں ٹوٹ جائے

کچھ ہم سے بے خودی میں ہوئیں بے حجابیاں
چشمک زنی ستاروں نے کی پھول مسکرائے

ناداں سہی، پر اتنے بھی ناداں نہیں ہیں ہم
خود ہم نے جان جان کے کتنے فریب کھائے

وہ جانِ آرزو کہ ہے سرمایۂ نشاط
کیوں اس کی یاد، غم کی گھٹا بن کے دل پہ چھائے

کہتے تھے "تم سے چھوٹ کے کیونکر جئیں گے ہم"
جیتے ہیں تم سے چھوٹ کے، تقدیر جو دکھلائے

مایوسیوں میں دل کا وہ عالم، دمِ وداع
بجھتے ہوئے چراغ کی لو جیسے تھرتھرائے

تم تو ہمیں کو کہتے تھے، یہ تم کو کیا ہوا
دیکھو! کنول کے پھولوں سے شبنم چھلک نہ جائے

اک ناتمام خواب، مکمل نہ ہو سکا
آنے کو زندگی میں بہت انقلاب آئے

عندلیب شادانی

نگاہ و دل کا افسانہ قریبِ اختتام آیا
ہمیں اب اس سے کیا؟ آئی سحر یا وقتِ شام آیا
زبانِ عشق پر اک چیخ بن کر تیرا نام آیا
خرد کی منزلیں طے ہو چکیں دل کا مقام آیا
اُٹھانا ہے جو پتھر رکھ کے سینہ پر وہ گام آیا
محبّت میں تری ترکِ محبت کا مقام آیا
اسے آنسو نہ کہہ اک یادِ ایامِ گذشتہ ہے
مری عمرِ رواں کو عمرِ رفتہ کا سلام آیا
ذرا تو اور دل کی تیز کر سیلا سا یہ شعلہ
نہ روشن کر سکا گھر کو نہ محفل ہی کے کام آیا
مکمل تبصرہ کرتا ہوا ایامِ رفتہ پر
نگاہِ بےسخن میں ایک اشکِ بے کلام آیا
توانا کو بہانہ چاہیئے شاید تشدّد کا
پھر اک مجبور پر شوریدگی کا اتہام آیا
نہ جانے کتنی شمعیں گل ہوئیں کتنے بجھے تارے
تب اک خورشید اتراتا ہوا بالائے بام آیا
برہمن آبِ گنگا شیخ کوثر لے اُڑا اس سے
ترے ہونٹوں کو جب چھوتا ہوا مُلّاؔ کا جام آیا

آنند نرائن مُلّاؔ

نہ محتسب کی نہ حور و جناں کی بات کرو | مے کہن کی نگارِ جواں کی بات کرو
کسی کی تابشِ رخسار کا کہو قصہ | کسی کے گیسوئے عنبر فشاں کی بات کرو
ضیا ہے شاہد و شمع و شراب سے اس کی | فروغِ محفلِ روحانیاں کی بات کرو
جو مدعا ہو کسی قبلۂ مراد کا ذکر | تو آستانۂ پیرِ مغاں کی بات کرو
نہیں ہوا جو طلوع آفتاب تو فی الحال | قمر کی بات کرو کہکشاں کی بات کرو
رہے گا مشغلۂ یادِ رفتگاں کب تک | گزر رہا ہے جو۔ اس کارواں کی بات کرو
یہ قید و صید کے اندیشہ ہائے بے جا کیا | چمن کی فکر کرو آشیاں کی بات کرو
یہی جہان ہے ہنگامہ زار سود و زیاں | اسی کے سود اسی کے زیاں کی بات کرو
اب اس چمن میں نہ صیاد ہے نہ گلچیں ہے | کرو۔ تو اب تم باغباں کی بات کرو

خدا کے ذکر کا موقع نہیں یہاں سالک
دیارِ ہند میں حسنِ بتاں کی بات کرو

عبدالمجید سالک

جمودِ آب و گل جو ہے وہ جاتا ہے کہاں مجھ سے
عبث فریاد کرتا ہے درائے کارواں مجھ سے

نظر نظارہ خو میری جبیں ہنگامہ جو میری
نمایاں ہے مرا شوقِ سجودِ آستاں مجھ سے

مرے دل نے مری آنکھوں سے رکھا تجھ کو پوشیدہ
تری جب بات آئی رُک گئی میری زباں مجھ سے

تم اپنی انقلاب انگیزیوں کی داستاں سن لو
اگر سُن لو کسی دن آ کے میری داستاں مجھ سے

خبر کس کو نہیں ہے تیری شانِ بے نیازی کی
نہیں معلوم پھر کیوں ہے زمانہ بدگماں مجھ سے

کسی صورت قفس میں زندگی اپنی گذر جاتی
سلوک اچھا نہیں کرتی ہے یادِ آشیاں مجھ سے

سرِ محفل چرانا آنکھ کا تھا ایک افسانہ
وہ تو نے کہہ دیا خود جو نہ ہوتا تھا بیاں مجھ سے

نیازِ بندگی کو دیکھ کر یہ شانِ استغناء
بتا کیا چاہتا ہے تیرا نازِ جانستاں مجھ سے

کیا تھا روحِ غالبؔ سے جو میں نے کسبِ فنِ وحشت
سخنور سیکھتے ہیں آج اندازِ بیاں مجھ سے

رضا علی وحشت کلکتوی

محبت کس قدر یاس آفریں معلوم ہوتی ہے
ترے ہونٹوں کی ہر جنبش نہیں معلوم ہوتی ہے

یہ کس کے آستاں پر مجھ کو ذوقِ سجدہ لے آیا
کہ آج اپنی جبیں اپنی جبیں معلوم ہوتی ہے

محبت تیرے جلوے کتنے رنگا رنگ جلوے ہیں
کہیں محسوس ہوتی ہے کہیں معلوم ہوتی ہے

جوانی مٹ گئی لیکن خلش دردِ محبت کی
جہاں معلوم ہوتی تھی وہیں معلوم ہوتی ہے

اُمیدِ وصل نے دھوکے دیئے ہیں اس قدر حسرت
کہ اس کافر کی ہاں بھی اب نہیں معلوم ہوتی ہے
چراغ حسن حسرت

دستِ خرد سے پردہ کشائی نہ ہو سکی
حسنِ ازل کی جلوہ نمائی نہ ہو سکی

رنگِ بہار دے نہ سکے خارزار کو
دشتِ جنوں میں آبلہ سائی نہ ہو سکی

اے دل تجھے اجازتِ فریاد ہے، مگر
رُسوائی ہے اگر شنوائی نہ ہو سکی

مندر بھی صاف ہم نے کئے مسجدیں بھی پاک
مشکل یہ ہے کہ دل کی صفائی نہ ہو سکی

رسیا تھے بسکہ نغمۂ شیریں کے اہلِ بزم
مقبول اپنی تلخ نوائی نہ ہو سکی

غافل نہ تجھ سے اے غمِ عقبیٰ تھے ہم، مگر
دامِ غمِ جہاں سے رہائی نہ ہو سکی

مُنکر ہزار بار خدا سے ہوا بشر
اک بار بھی بشر سے خدائی نہ ہو سکی

"فکرِ معاش و عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں"
ان مشکلوں سے عہدہ برآئی نہ ہو سکی

خود زندگی بُرائی نہیں ہے تو اور کیا
محروم جب کسی سے بھلائی نہ ہو سکی

تلوک چند محروم

میری وفائیں یاد کرو گے
روؤ گے فریاد کرو گے

ہم بھی ہنسیں گے تم پر اک دن
تم بھی کبھی فریاد کرو گے

دشمن تک کو بھول گئے ہو
مجھ کو تم کیا یاد کرو گے

جا کر بھی ناشاد کیا تھا
آ کر بھی ناشاد کرو گے

مجھ کو تو برباد کیا ہے
اور کسے برباد کرو گے

محفل کی محفل ہے غم گیں
کس کس کا دل شاد کرو گے

ختم ہوئی دشنام طرازی
یا کچھ اور ارشاد کرو گے

چھوڑو بھی تاثیر کی باتیں
کب تک اس کو یاد کرو گے

تاثیر

یہ کیا طلسم ہے دنیا پہ بار گزری ہے
وہ زندگی جو سرِ رہگذار گزری ہے

کہیں سحر کا اُجالا ہوا ہے ہم نفسو!
کہ موجِ برق سرِ شاخسار گزری ہے

رہا ہے یہ سرِ شوریدہ مثلِ شعلہ بُلند
اگرچہ مجھ پہ قیامت ہزار گزری ہے

یہ حادثہ بھی ہوا ہے کہ عشق یار کی یاد
دیارِ قلب سے بیگانہ وار گزری ہے

گلوں کی خوں شدگی سے سُراغ ملتا ہے
کہیں چمن سے نسیمِ بہار گزری ہے

مقیمِ کوچۂ دلدار کو پتہ بھی نہیں
کدھر سے زندگیٔ مستعار گزری ہے

انہیں کو عرضِ وفا کا تھا اشتیاق بہت
انہیں کو عرضِ وفا ناگوار گزری ہے

کبھی ہجومِ غمِ روزگار دیکھا ہے
کبھی مصیبتِ ہجرانِ یار گزری ہے

حریمِ شوق مہکتا ہے آج تک عابدؔ
یہاں سے نکہتِ گیسوئے یار گزری ہے

عابد علی عابدؔ

نظر میں ڈھل کے اُبھرتے ہیں دل کے افسانے
یہ اور بات ہے دنیا نظر نہ پہچانے
وہ بزم دیکھی ہے میری نگاہ نے کہ جہاں
بغیر شمع بھی جلتے رہے ہیں پروانے
یہ کیا بہار کا جوبن یہ کیا نشاط کا رنگ
فسردہ میکدے والے اُداس میخانے
مرے ندیم تری چشمِ التفات کی خیر
بگڑ بگڑ کے سنورتے گئے ہیں افسانے
یہ کس کی چشمِ فسوں ساز کا کرشمہ ہے
کہ ٹوٹ کر بھی سلامت ہیں دل کے بتخانے
نگاہ ناز ہیں دل سوزیٔ نیاز کہاں
یہ آشنائے نظر ہیں دلوں کے بیگانے

صوفی تبسم

کام آسکیں نہ اپنی وفائیں تو کیا کریں
اک بے وفا کو بھول نہ جائیں تو کیا کریں

مجھ کو یہ اعتراف، دعاؤں میں ہے اثر
جائیں نہ عرش پر جو دعائیں تو کیا کریں

اک دن کی بات ہو تو اُسے بھول جائیں ہم
نازل ہوں دل پہ روز بلائیں تو کیا کریں

ظلمت بدوش ہے مری دُنیائے عاشقی
تاروں کی مشعلیں نہ چرائیں تو کیا کریں

شب بھر تو اُن کی یاد میں تارے گِنا کیے
تارے سے دن کو بھی نظر آئیں تو کیا کریں

عہدِ طرب کی یاد میں رُویا کیے بہت
اب مُسکرا کے بھول نہ جائیں تو کیا کریں

اب جی میں ہے کہ اُن کو بُھلا کر ہی دیکھ لیں
وہ بار بار یاد جو آئیں تو کیا کریں

وعدے کے اعتبار میں تسکینِ دل تو ہے
اب پھر وہی فریب نہ کھائیں تو کیا کریں

ترکِ وفا بھی جرمِ محبت سہی اختر
ملنے لگیں وفا کی سزائیں تو کیا کریں

اختر شیرانی

جو رشتۂ گل و شبنم سمجھ نہیں سکتے
میری نشاط میرا غم سمجھ نہیں سکتے

خوشی کو نذرِ محبت تو کر دیا، لیکن
مآلِ دیدۂ پُرنم سمجھ نہیں سکتے

وہ میرے ساتھ نہ آئیں جو دار و زنداں کو
نشاطِ شوق کا پرچم سمجھ نہیں سکتے

ہزار سایۂ عصیاں خُنک سہی، لیکن
ہم اس کو دامنِ مریم سمجھ نہیں سکتے

ستم تو یہ ہے میرے اشک پونچھنے والے
وجوہِ گریۂ پیہم سمجھ نہیں سکتے

خدا گواہ کہ ہم صرف ماہ و انجم تک
رسائیِ دلِ آدم سمجھ نہیں سکتے

ہمیں خبر ہے، ہمیں تجربہ ہے برسوں کا
کسی کو ہم تیرا محرم سمجھ نہیں سکتے

ہیں خود غرض جو محبت کے باوجود اے دوست!
تیری رضا کو مقدم سمجھ نہیں سکتے

فریبِ حسن ہو، یا جبرِ عشق، ہم احسان
جو آگ ہے اسے شبنم سمجھ نہیں سکتے

احسان دانش

تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے

جنوں میں جتنی بھی گزری بکار گزری ہے
اگرچہ دِل پہ خرابی ہزار گزری ہے

ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گزری ہے

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے

نہ گُل کھِلے ہیں، نہ اُن سے مِلے نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے

چمن پہ غارتِ گُلچیں سے جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے

فیض احمد فیضؔ

تغافل خود ہے اقرارِ محبت　　یہ خاموشی ہے گفتارِ محبت

نہاں ہو یا نمایاں ہو بہر طور　　محبت ہے سزاوارِ محبت

دلِ مہتاب ہو یا چشمِ انجم　　نہیں ہے کون بیمارِ محبت

وہ لغزیدہ نگاہیں کہہ رہی ہیں　　دلِ نازک پہ ہے بارِ محبت

ز سر تا پا محبت بن گئے ہو　　یہی ہوتا ہے انکارِ محبت

تمنائیں ہوئی جاتی ہیں روپوش　　کھلے جاتے ہیں اسرارِ محبت

شبستانِ ارم سے کھینچ لائی　　نسیمِ صبح گلزارِ محبت

یہ کیا جانیں وہ رم خوردہ نگاہیں
رونق بھی ہے گرفتارِ محبت

رونق صدیقی

عدؔم

غمِ محبت ستا رہا ہے، غمِ زمانہ مَسل رہا ہے
مگر مرے دن گزر رہے ہیں مگر مرا وقت ٹل رہا ہے

وہ ابر آیا وہ رنگ برسے وہ کیف جاگا وہ جام کھنکے
چمن میں یہ کون آ گیا ہے تمام موسم بدل رہا ہے

مری جوانی کے گرم لمحوں پہ ڈال دے گیسوؤں کا سایہ
یہ دوپہر کچھ تو معتدل ہو تمام ماحول جل رہا ہے

یہ بھینی بھینی سی مست خوشبو یہ ہلکی ہلکی سی دلنشیں بُو
یہیں کہیں تیری زلف کے پاس کوئی پروانہ جل رہا ہے

نہ دیکھ او مہ جبیں مری سمت اتنی مستی بھری نظر سے
مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے شراب کا دور چل رہا ہے

عدؔم خرابات کی سحر ہے کہ بارگاہِ رموزِ مستی
اِدھر بھی سورج نکل رہا ہے اُدھر بھی سورج نکل رہا ہے

عدؔم

شباب آیا کسی بُت پر فدا ہونے کا وقت آیا
مری دنیا میں بندے کے خدا ہونے کا وقت آیا

اُسے دیکھا تو زاہد نے کہا ایمان کی یہ ہے
کہ اب انسان کو سجدہ روا ہونے کا وقت آیا

تکلّم کی خموشی کہہ رہی ہے حرفِ مطلب سے
کہ اشک آمیز نظروں سے ادا ہونے کا وقت آیا

ہمیں بھی آ پڑا ہے دوستوں سے کام کچھ یعنی
ہمارے دوستوں کے بے وفا ہونے کا وقت آیا

نویدِ سر بلندی دی منجّم نے تو میں سمجھا
سگانِ دہر کے آگے دوتا ہونے کا وقت آیا

ہری چند اختر

انھیں اپنے ستم پر کیا ندامت ہو نہیں سکتی
مگر میں کیا کروں مجھ سے شکایت ہو نہیں سکتی
محبّت اپنی شدّت میں جنوں ہی کیوں نہ ہو جائے
تمہارے حسن کے قابل محبّت ہو نہیں سکتی!
تجھے، یا اہلِ محفل کو تیرے کیا غم قیامت کا
تیری محفل سے باہر تو قیامت ہو نہیں سکتی
محبّت جھولیاں اپنے گلے میں ڈال سکتی ہے
مگر وابستۂ دامانِ دولت ہو نہیں سکتی
خداوندانِ دنیا کا تکبّر ہیچ ہے بسملؔ
خدائی کیا کریں گے جن سے خدمت ہو نہیں سکتی

بسملؔ سعیدی

کوئی حد بھی ہے آخر امتحاں کی
الٰہی خیر قلبِ ناتواں کی
یہ ہے اک مُہر بے بال و پری پر
رہائی بھی رہائی ہے کہاں کی
خزاں کا وسوسہ ہے فصلِ گُل کا
ضرورت ہے بہارِ بے خزاں کی
زمیں پر ہیں وہ کچھ مٹی کے پتلے
کہ جن میں رفعتیں ہیں آسماں کی

گوپی ناتھ آمن

مخمورؔ دہلوی

کسی سے میری منزل کا پتا پایا نہیں جاتا
جہاں میں ہوں فرشتوں سے وہاں جایا نہیں جاتا

مرے ٹوٹے ہوئے پائے طلب کا مجھ پر احساں ہے
تمہارے در سے اُٹھ کر اب کہیں جایا نہیں جاتا

محبت ہو تو جاتی ہے، محبت کی نہیں جاتی
یہ شعلہ خود بھڑک اُٹھتا ہے بھڑکایا نہیں جاتا

فقیری میں بھی مجھ کو مانگنے سے شرم آتی ہے
سوالی ہو کے مجھ سے ہاتھ پھیلایا نہیں جاتا

چمن تم سے عبارت ہے بہاریں تم سے زندہ ہیں
تمہارے سامنے پھولوں سے مرجھایا نہیں جاتا

ہر اک داغِ تمنّا کو کلیجے سے لگاتا ہوں
کہ گھر آئی ہوئی دولت کو ٹھکرایا نہیں جاتا

محبت کیلئے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں
یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا

محبت اصل میں مخمورؔ وہ رازِ حقیقت ہے
سمجھ میں آگیا ہے پھر بھی سمجھایا نہیں جاتا

مخمورؔ دہلوی

کچھ اس ادا سے خونِ تمنّا کیا گیا
جیسے مری طرف سے تقاضا کیا گیا

سچ تو یہ ہے کہ غم ہی محبت کی جان ہے
تیرے لئے خوشی کو گوارا کیا گیا

میں اپنی غم پرست طبیعت کو کیا کروں
جب خود ہوا نہ درد تو پیدا کیا گیا

اُتنے ہی وہ گرفتِ نظر سے تھے دور دور
جتنا قریب جا کے نظارا کیا گیا

وہ ہنس دیئے کہ عرضِ تمنّا فضول ہے
میں اس خیال میں کہ اشارا کیا گیا

وہ خود بھی آپ اپنے ہی جلووں میں محو تھے
اُن کی نظر سے ان کا نظارا کیا گیا

ماہر القادری

کوئی کس طرح رازِ اُلفت چھپائے
نگاہیں ملیں اور قدم ڈگمگائے

وہ مجبوریوں پر مری مُسکرائے
یہاں تک تو پہونچے یہاں تک تو آئے

محبت میں کچھ اتفاقات بھی تھے
کہ جو میری تقدیر بننے نہ پائے

ترا غم بھلا کیا چھپائے سے چھُپتا
بہت اشک روکے بہت مُسکرائے

وہ اِس طرح میرے برابر سے گذرے
ادائیں سنبھالے نگاہیں جھکائے

زمانے کے جور و ستم توبہ توبہ
کہ اکثر تو مجھ کو نہ تم یاد آئے

ترے روبرو گر نظر مطمئن ہو
تو سینے میں دل بھی دھڑکنے نہ پائے

میں اِس احتیاطِ نظر کے تصدّق
نہ بیگانہ سمجھے نہ اپنا بنائے

یہی تو جواب شکایت تھا نخشبؔ
مرے شعر اس نے مجھی کو سُنائے

نخشب جارچوی

شکیل

غمِ عاشقی سے کہہ دو رہِ عام تک نہ پہنچے
مجھے خوف ہے یہ تہمت میرے نام تک نہ پہنچے

میں نظر سے پی رہا تھا کہ یہ دل نے بد دعا دی
تیرا ہاتھ زندگی بھر کبھی جام تک نہ پہنچے

وہ نوائے مضمحل کیا نہ ہو جس میں دل کی دھڑکن
وہ صدائے اہلِ دل کیا جو عوام تک نہ پہنچے

نئی صبح پر نظر ہے مگر آہ یہ بھی ڈر ہے
یہ سحر بھی رفتہ رفتہ کہیں شام تک نہ پہنچے

میرے طائرِ قفس کو نہیں باغباں سے رنجش
ملے گھر میں آب و دانہ تو یہ دام تک نہ پہنچے

یہ ادائے بے نیازی تجھے بے وفا مبارک
مگر ایسی بے رُخی کیا کہ سلام تک نہ پہنچے

جو نقابِ رُخ اُٹھا دی تو یہ قید بھی لگا دی
اُٹھے ہر نگاہ لیکن کوئی بام تک نہ پہنچے

تمہیں اپنے دل کی خبریں میرے دل سے مل رہی ہیں
میں جو تم سے روٹھ جاؤں تو پیام تک نہ پہنچے

شکیل بدایونی

وہ تصادمِ نگہِ حسیں تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ نظر کی لغزشِ اولیں تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ فروغِ روئے سحر جبیں تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ خرامِ زلفِ شب آفریں تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی موجِ کوثرِ گل فشاں کبھی برقِ شعلۂ بے اماں
وہ تبسمِ لبِ نازنیں تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

بصد احترام و بصد ادب وہ سوالِ شوق بیک طلب
وہ ہزار بار نہیں نہیں تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ باحتیاط قدم قدم کسی خاص فکر کی الجھنیں
وہ کہیں خیال نظر کہیں تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ تجلیوں کے ہجوم میں مری تابِ دید کا امتحاں
کبھی دور دل سے کبھی قریں تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جو تمہیں نہ اپنا بنا سکا اُسی نامراد کی لاش پر
وہ نمیدہ دامنِ آستیں تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

لبِ جو کنارِ بہشتِ گل کبھی پائے ناز کی آہٹیں
ہمہ رقص و نغمہ دلنشیں تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

پسِ مرگ بھی جسے انتظارِ کرم میں نیند نہ آسکی
وہی دیدۂ دمِ واپسیں تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے عمر بھر یہ گماں رہا کہ نہ ہو سکوں گا کبھی جُدا
وہ فریب خوردۂ صد یقیں تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے کہیے انور مبتلا وہ نظر شناس ادا ادا
وہی نکتہ رس وہی نکتہ چیں تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

علامہ انور صابری

راتوں کو تصوّر ہے اُن کا اور چپکے چپکے رونا ہے
اے صبح کے تارے، تو ہی بتا! انجام مرا کیا ہونا ہے
ان نورس آنکھوں والوں کا کیا ہنسنا ہے، کیا رونا ہے
بہے ہوئے سچّے موتی ہیں، بہتا ہوّا خالص سونا ہے
دل کو کھویا، خود بھی کھوئے، دنیا کھوئی، دین بھی کھویا
یہ گم شدگی ہے تو اک دن اے دوست! تجھے بھی کھونا ہے
تمیزِ کمال و نقص اٹھا یہ تو روشن ہے دنیا پر
میں چندن ہوں تو کندن ہے، میں مٹی ہوں تو سونا ہے
تو یہ نہ سمجھ للّٰلہ! کہ ہے تسکین ترے دیوانوں کو
وحشت میں ہمارا ہنس پڑنا، دراصل ہمارا رونا ہے
ماتم ہے مری آوازِ شکست سازِ دلِ صد پارہ کا
ساغر میرا نغمہ بھی دیپک کے سُروں میں رونا ہے

ساغر نظامی

غرورِ حسن کو ہم سادہ طینت بے رُخی سمجھے
طرازِ دلبری کو شیوۂ بیگانگی سمجھے
ابھی اُس رند کو آتے نہیں آدابِ مے خانہ
جو اپنی تشنگی کو بخلِ ساقی کی کمی سمجھے
حریمِ حسن میں جا کر ہمیں تو ہوش کھوئے تھے
نہ رمزِ دل دہی جانا، نہ رازِ دلبری سمجھے
گرفتارِ طلسمِ دلبری تھے وہ بھی کیا کرتے
جگر خوں ہو گیا غنچوں کا اور گُل کی ہنسی سمجھے
وہی تو زندگی کی ظلمتوں سے جیت سکتے ہیں
جو اِک تیرے تبسّم کو مآلِ زندگی سمجھے

آل احمد سرور

جب وہ مسرور نظر آتا ہے
ہر طرف نور نظر آتا ہے

میں تو میخوار ہوں تو کیوں ساقی
نشے میں چُور نظر آتا ہے

قرب سے ہاتھ اُٹھایا میں نے
تُو بڑی دور نظر آتا ہے

میں ہی تنہا نہیں دل کے ہاتھوں
تُو بھی مجبُور نظر آتا ہے

خاکساری کو چھپانے کے لئے
وجد مغرور نظر آتا ہے

سکندر علی وجد

چمن کو آگ لگانے کی بات کرتا ہوں
سمجھ سکو تو ٹھکانے کی بات کرتا ہوں

سحر کو شمع جلانے کی بات کرتا ہوں
یہ غافلوں کو جگانے کی بات کرتا ہوں

روش روش پہ بچھا دو ببول کے کانٹے
چمن سے لطف اٹھانے کی بات کرتا ہوں

"وہ باغبان جو پودوں سے بیر رکھتا ہے"
یہ آپ ہی کے زمانے کی بات کرتا ہوں

شراب سرخ کی موجوں سے مدعا ہوگا
اگر میں خون بہانے کی بات کرتا ہوں

وہ صرف اپنے لئے جام کر رہے ہیں طلب
میں ہر کسی کو پلانے کی بات کرتا ہوں

یہاں چراغ تلے لوٹ ہے اندھیرا ہے
کہاں چراغ جلانے کی بات کرتا ہوں

اُس انجمن سے اُٹھا ہوں کھری کھری کہہ کر
پھر انجمن میں نہ آنے کی بات کرتا ہوں

دبی زباں سے گزارش ہے ناگوار اگر
تو کیا سوال اُٹھانے کی بات کرتا ہوں

نقاب رُوئے زمانہ نہ اُٹھ سکے گی کہ میں
گلوں سے اوس اُٹھانے کی بات کرتا ہوں

گھسے ہوؤں کو نئی فکر دے رہا ہوں شاد
منجھے ہوؤں کو سکھانے کی بات کرتا ہوں

شاد عارفی

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے شورشِ دوراں بھول گئے
وہ زُلفِ پریشاں بھول گئے وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

اے شوقِ نظارہ کیا کہیے نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوقِ تصوّر کیا کیجے ہم صورتِ جاناں بھول گئے

اب گُل سے نظر ملتی ہی نہیں اب دل کی کلی کھِلتی ہی نہیں
اے فصلِ بہاراں رخصت ہو ہم لطفِ بہاراں بھول گئے

سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

یہ اپنی وفا کا عالم ہے اب اُن کی جفا کو کیا کہیے
اک نشترِ زہر آگیں رکھ کر نزدیکِ رگِ جاں بھول گئے

مجؔاز لکھنوی

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں، جینے کی تمنا کون کرے
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا، اب خواہشِ دنیا کون کرے
جب کشتی ثابت و سالم تھی، ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے
جو آگ لگائی تھی تم نے، اس کو تو بجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے، اُس آگ کو ٹھنڈا کون کرے
دنیا نے ہمیں چھوڑا جذبی، ہم چھوڑ نہ دیں کیوں دنیا کو
دنیا کو سمجھ کر بیٹھے ہیں، اب دنیا دنیا کون کرے

معین احسن جذبی

عیشِ دنیا جسے کہتے ہیں فدا ہے تم پر
ہم دل اپنا غمِ دوراں کو دیئے بیٹھے ہیں

یم ہستی کی تم اک موجِ سکوں پرور ہو
دل میں ہم حشر کے طوفان لئے بیٹھے ہیں

پھول جھڑتے ہیں دمِ نطق تمہارے منہ سے
تلخ گفتار ہیں ہم، ہونٹ سیئے بیٹھے ہیں

بادۂ ناب سے سرشار ہو شاداب ہو تم
غم سلامت رہے ہم زہر پیئے بیٹھے ہیں

عمر بھر اور دل کو برباد کیا ہے تم نے
اور ہم خود کو ہی برباد کئے بیٹھے ہیں

اختر انصاری

کروٹیں وقت کی بیکار ہوئی جاتی ہیں
اور بھی درپئے آزار ہوئی جاتی ہیں

کس کے انفاس میں پنہاں ہیں بہاروں کے ہجوم
کونپلیں پھوٹ کے گلزار ہوئی جاتی ہیں

گتھیاں ولولۂ شوق کی سلجھیں کیوں کر
جتنی کھلتی ہیں پُراسرار ہوئی جاتی ہیں

نت نیا دور، نئی آس، نیا بہلاوا
گردشیں میری خریدار ہوئی جاتی ہیں

ہر تقاضے پہ نیا ضابطہ رہتا ہے سوار
روحیں لفظوں میں گرفتار ہوئی جاتی ہیں

شاید اب عشق ہے نومیدیٔ جاوید کا نام
آنکھیں رونے کی گنہگار ہوئی جاتی ہیں

شاید اب ابر کے چھٹنے کا گماں باطل ہے
صبحیں ہم رنگِ شبِ تار ہوئی جاتی ہیں

احمد ندیم قاسمی

جس تمنا پر شباب آیا اُسے موت آ گئی
زندگی بھی زندگی کے نام سے شرما گئی

خواہشِ معدوم اچھی خواہشِ ناکام سے
حیف اس پر پھول بن کر جو کلی مُرجھا گئی

آہ عبرت ناک تھا کتنا بیانِ عاشقی
زندگی کی داستاں سے زندگی گھبرا گئی

کون ہوگا اب ہدف ناکامیٔ تدبیر کا
زندگی کی راہ میں تقدیر تو کام آ گئی

مار ڈالا عرشؔ یوں تو دوستوں کے لطف نے
یہ غنیمت ہے کہ آخر زندگی کام آ گئی

عرشؔ ملسیانی

ساز بے مطرب و مضراب نظر آتے ہیں
پھر بھی نغمے ہیں کہ بے تاب نظر آتے ہیں

وہی محفل ہے، وہی رونقِ محفل، لیکن
کتنے بدلے ہوئے آداب نظر آتے ہیں

کیا تماشا ہے کہ غنچے تو ہیں پژمردہ و زرد
خار آسودہ و شاداب نظر آتے ہیں

قافلہ آج یہ کس موڑ پہ آ پہنچا ہے
اب قدم اور بھی بے تاب نظر آتے ہیں

کل کریں گے یہی طغیانِ گُلِ تر پیدا
آج جو آگ کے سیلاب نظر آتے ہیں

کل یہی خوابِ حقیقت میں بدل جائیں گے
آج جو خواب فقط خواب نظر آتے ہیں

کون سا مہرِ درخشاں ہے اُبھرنے والا!
آئینے دل کے شفق تاب نظر آتے ہیں

مسکراتے ہوئے فردا کے اُفق پر اختر
ایک کیا سینکڑوں مہتاب نظر آتے ہیں

جاں نثار اختر

تنگ آچکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم
ٹھکرا نہ دیں جہاں کو کہیں بے دلی سے ہم

مایوسیٔ مآلِ محبت نہ پوچھئے
اپنوں سے پیش آئے ہیں بیگانگی سے ہم

لو آج ہم نے توڑ دیا رشتۂ امید
لو اب کبھی گلہ نہ کریں گے کسی سے ہم

ابھریں گے ایک بار ابھی دل کے ولولے
گو دب گئے ہیں بارِ غمِ زندگی سے ہم

گر زندگی میں مل گئے پھر اتفاق سے
پوچھیں گے اپنا حال تری بے بسی سے ہم

اللہ رے فریبِ مشیت کہ آج تک
دنیا کے ظلم سہتے رہے خامشی سے ہم

ساحرلدھیانوی

ہوس نصیب نظر کو کہیں قرار نہیں
میں منتظر ہوں مگر تیرا انتظار نہیں

ہمیں سے رنگِ گلستاں ہمیں سے رنگِ بہار
ہمیں کو نظمِ گلستاں پر اختیار نہیں

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

تمہارے عہدِ وفا کو میں عہد کیا سمجھوں
مجھے خود اپنی محبت کا اعتبار نہیں

نہ جانے کتنے گلے اس میں مضطرب ہیں ندیم
وہ ایک دل جو کسی کا گلہ گذار نہیں

گریز کا نہیں قائل حیات سے لیکن
جو سچ کہوں تو مجھے موت ناگوار نہیں

یہ کس مقام پہ پہنچا دیا زمانے نے
کہ اب حیات پہ تیرا بھی اختیار نہیں

ساحر لدھیانوی

اے دل اُلجھ گیا ہے مذاقِ نظر کہاں
منزل کہاں یہ حسنِ سرِ رہ گذر کہاں
اک بار اگر قفس کی ہوا راس آ گئی
اے خود فریب! پھر ہوسِ بال و پر کہاں

گم ہو چکی ہے کاہکشاں گردِ راہ میں
اب دیکھئے ہو ختم ہمارا سفر کہاں
مانا چمن میں حکم زباں بندیوں کے ہیں
رازِ جنوں کو فاش کریں ہم مگر کہاں

گلشن میں خامشی ہے مرے اس سوال پر
ٹھہرے گا کاروانِ نسیمِ سحر کہاں
خارا شگافیوں کے زمانے گذر گئے
اب ڈھونڈتا ہی شوق کہ ہیں شیشہ گر کہاں
آزاد چل کوئی نئی دنیا تلاش کر
جلوے یہاں بقدرِ مذاقِ نظر کہاں

جگن ناتھ آزاد

مجروح

یہ رُکے رُکے سے آنسو یہ گھٹی گھٹی سی آہیں
یونہی کب تلک خدایا غمِ زندگی نباہیں

کہیں ظلمتوں میں گھِر کر ہے تلاشِ دستِ رہبر
کہیں جگمگا اٹھی ہیں مرے نقشِ پا سے راہیں

ترے خانماں خرابوں کا چمن کوئی نہ صحرا
یہ جہاں بھی بیٹھ جائیں وہیں ان کی بارگاہیں

کبھی جادۂ طلب سے جو پھرا ہوں دلِ شکستہ
تری آرزو نے ہنس کر وہیں ڈال دی ہیں بانہیں

مجروح سلطانپوری

قتیلؔ شفائی

اندیشۂ اربابِ حرم ساتھ رہے گا
جنت بھی ملے گی تو یہ غم ساتھ رہے گا

پیاسے ہی گذر جائیں گے ہم راہِ طلب سے
عبرت کے لئے ساغرِ جم ساتھ رہے گا

تو اور نہ آئے درِ زندان دفا تک
مر کر بھی یہ غم تیری قسم ساتھ رہے گا

افلاک سے پلکوں پر اُتر آئیں گے تارے
کھل کر بھی شبِ غم کا بھرم یاد رہے گا

منزل سے پلٹ آئے گی ایک ایک تجلّی
ہاں شعلۂ رخسارِ صنم ساتھ رہے گا

میخانہ بہت دُور نہیں دیدۂ غم سے
آ گردشِ دوراں کوئی دم ساتھ رہے گا

راہوں میں قتیلؔ آئیں گے سو آئینہ خانے
لیکن مرا گلپوش قلم ساتھ رہے گا

قتیلؔ شفائی

خود ہی میں ساقی تھا خود میکش تھا خود ہی جام تھا
ہائے وہ دن جب مرے جلوے تھے تیرا بام تھا
میری کم ظرفی کہ تیرے سامنے رویا کیا
رنج میں بھی مسکرایا تو یہ تیرا کام تھا
دل کی بربادی میں کچھ لذّت ہی تھی ورنہ مجھے
آپ سے کیا کام ہوتا، آپ سے کیا کام تھا
تیری خاموشی نے خود داری سکھائی ہے مجھے
ورنہ دردِ عشق سر سے پاؤں تک پیغام تھا
آج وہ انداز بھی تیرا قیامت ہے مجھے
کل جو تھا دل کی مسرّت روح کا آرام تھا
کس طرح اُس گھر کو خالی دیکھیے جس گھر میں کل
آپ تھے اور آپ کا میکشؔ تھا دورِ جام تھا

میکشؔ اکبر آبادی

ہوئے اب وہ عہدِ رنگیں غمِ روزگار میں گم
نہ گِنا کرو ستارے مرے انتظار میں تم
میں رہا بہت محبّت کی لطافتوں میں گُم سُم
مگر اب معاشقے کا ہے معاش سے تصادم
ابھی سب کی محنتوں پر تو کچھ اہلِ زر ہیں قابض
میں اڑھاؤں تم کو کیونکر مری جاں رِدائے انجم
تجھے مجھ سے ہے محبّت تو شریکِ رزم ہو جا
ہے یہ وقت کا تقاضا یہ حفظِ ماتقدم

مظفر علی مظفؔر

اور تو کوئی بس نہ چلے گا ہجر کے درد کے ماروں کا
صبح کا ہونا دوبھر کر دیں رستہ روک ستاروں کا

جھوٹے سکّوں میں بھی اُٹھا دیتے ہیں یہ اکثر سچّا مال
شکلیں دیکھ کے سودے کرنا کام ہوا بنجاروں کا

اپنی زباں سے کچھ نہ کہیں گے چپ ہی رہیں گے عاشق لوگ
تم سے تو اتنا ہو سکتا ہے پوچھو حال بچاروں کا

جس جپسی کا ذکر ہے تم سے، دل کو اسی کی کھوج رہی
یوں تو ہمارے شہر میں اکثر میلا لگا ہے نگاروں کا

ایک ذرا سی بات تھی جس کا چرچا پہنچا گلی گلی
ہم گمناموں نے پھر بھی احسان نہ مانا یاروں کا

درد کا کہنا چیخ ہی اٹھو، دل کی نصیحت وضع نبھاؤ
سب کچھ سہنا چپ چپ رہنا کام ہے عزت داروں کا

انشاء اب انہی اجنبیوں میں چین سے باقی عمر کٹے
جن کی خاطر بستی چھوڑی نام نہ لو ان پیاروں کا

ابنِ انشاء

ہر اک شکستِ تمنّا پہ مسکراتے ہیں
وہ کیا کریں، جو مسلسل فریب کھاتے ہیں

کبھی کبھی تو وہ اس طرح یاد آتے ہیں
ہم اس کے بعد ہر اک شے کو بھول جاتے ہیں

یقینِ عشق نہیں، اعتبارِ حسن نہیں
یہ وہم کیا مرے دل میں سمائے جاتے ہیں

نگاہِ ناز بھی کیا چیز ہے، خدا جانے
نظر کے ساتھ زمانے بدلتے جاتے ہیں

کسی کے وعدۂ صبر آزما کی خیر کہ ہم
اب اعتبار کی حد سے گذرتے جاتے ہیں

راز مرادآبادی

اِن گھٹاؤں میں اُجالے کا بسیرا ہی سہی
خیر اگر آپ بضد ہیں تو سویرا ہی سہی

اے غمِ زیست بُلاتی ہیں مہکتی زلفیں
آج کی رات یہ پُر نور اندھیرا ہی سہی

دل میں جو آگ لگی ہے وہ کہاں بجھتی ہے
راہ شاداب سہی ابر گھنیرا ہی سہی

ہوشیار اہلِ خرد خاک نشیں آپہنچے
آپ کے زعم کا افلاک پہ ڈیرا ہی سہی

تو پریشان نہ ہو، خالقِ فردوسِ بریں
یہ جہنم یہ جہاں آج سے میرا ہی سہی

کتنی یادیں ہیں کہ ناگن کی طرح ڈستی ہیں
نورؔ ان گلیوں کا اک آخری پھیرا ہی سہی

نورؔ بجنوری

کوئی سمجھے گا کیا رازِ گلشن
جب تک اُلجھے نہ کانٹوں سے دامن

عظمتِ آشیانہ بڑھا دی
برق کو دوست سمجھوں یا دشمن

حسن ہے یوں پریشاں پریشاں
لٹ گیا ہو کوئی جیسے رہزن

یک بیک سامنے آ نہ جانا
رک نہ جائے کہیں دل کی دھڑکن

گل تو گل خار تک چن لئے ہیں
پھر بھی خالی ہے گلچیں کا دامن

وہ ہیں شرمندہ اپنے کرم پر
میں پشیمان ہوں پھیلا کے دامن

اتنی آرائشِ آشیانہ
ٹوٹ جائے نہ شاخِ نشیمن

ان گلوں سے تو کانٹے ہی اچھے
جن سے ہوتی ہو توہینِ گلشن

قلبِ پروانہ کی اُف رے دھڑکن
خود بخود ہو گئی شمع روشن

فناؔ کانپوری

گوپال متّل

تیرا خلوصِ دل تو محلِّ نظر نہیں
پر کچھ تو ہے جو تیری زباں میں اثر نہیں

اب وہ نہیں ہے جلوۂ شام و سحر کا رنگ
تیرا جمال شاملِ حسنِ نظر نہیں

ہے مرکزِ نگاہ ابھی تک وہ آستاں
یہ اور بات ہے کہ مجالِ سفر نہیں

اڑ بھی چلیں تو اب وہ بہارِ چمن کہاں
ہاں ہاں نہیں مجھے ہوسِ بال و پر نہیں

ترکِ تعلقات خود اپنا قصور تھا
اب کیا گلہ کہ اُن کو ہماری خبر نہیں

چپ چاپ سہہ رہے ہیں کہ اپنوں کا جور ہے
اب خوب جانتے ہیں فغاں کارگر نہیں

کچھ ہے تو اپنی زود یقینی سے ہے گِلہ
تجھ سے تو اب کلام بھی اے چارہ گر نہیں

گوپال متّل

تری برق پاشیوں کا نہ بنے کہیں نشانہ
ارے یہ قفس ہے ظالم نہیں میرا آشیانہ
غمِ دوست تجھ کو پا کر مجھے کیا نہیں میسّر
غمِ زندگی غمِ دل، غمِ جاں غمِ زمانہ
مرے ضبطِ آرزو کی تمہیں داد دے سکوگے
مرے آنسوؤں کو شاید نہ سمجھ سکے زمانہ
میں بہک بہک کے سنبھلا، میں سنبھل سنبھل کے بہکا
مری آنکھیں دیر و کعبہ مرا دل شراب خانہ
تری سادگی پہ قنبرؔ انھیں شک سا ہو چلا ہے
ترا شعر زاہدانہ۔ ترا زہد شاعرانہ

قنبر رضوی

چمن میں کس نے کسی بے نوا کا ساتھ دیا
وہ بُوئے گل تھی کہ جس نے صبا کا ساتھ دیا

دیا جو ساتھ تو پھر کس بلا کا ساتھ دیا
شکستِ غم نے ہر اک مدعا کا ساتھ دیا

فروغِ بادہ نے رنگِ حیا کا ساتھ دیا
غرض اُسی بُت کا فرادا کا ساتھ دیا

خیالِ یار ترا شکریہ رہِ غم میں
بس ایک تو نے دلِ مبتلا کا ساتھ دیا

نگاہِ شوق کے یہ حوصلے کوئی دیکھے
کہ ہر نظارۂ صبر آزما کا ساتھ دیا

تجھے خبر بھی نہیں ہے کہ دل کی دھڑکن نے
کہاں کہاں تری آوازِ پا کا ساتھ دیا

دلِ خراب کی یہ سادہ لوحیاں توبہ
جفا کے بعد بھی اہلِ جفا کا ساتھ دیا

اب اس سے آگے وہ مسجد یہ میکدہ تاباںؔ
بہت تو ہم نے کسی پارسا کا ساتھ دیا

غلام ربانی تاباںؔ

حجابِ حُسن کو اک پردۂ ذوقِ نظر جانا
اُسے ہم نے نہایت دور سے نزدیک تر جانا

یہاں تک چھوڑ کر اپنی محبت کا اثر جانا
کہ مجھ کو بے خبر دنیا و ما فیہا سے کر جانا

جنونِ عشق کو ہم نے یہاں تک معتبر جانا
گوارا کر لیا شیرازۂ ہستی بکھر جانا

ترے اندازِ استغنیٰ پہ ہم ایمان لے آئے
تری بے مہریٔ پیہم کو ایسا معتبر جانا

جہاں چاہے محبت، حُسن کو جلوہ کناں کر لے
غلط! دیر و حرم کی جستجو یا طُور پر جانا

وفا کی راہ میں گر جذبۂ کامل سہارا دے
بہت آسان ہے حدِّ تعیّن سے گذر جانا

وفورِ بیخودی میں یہ بھی پروانہ نہیں سمجھا!
سراسر عشق کی توہین ہے ناکام مر جانا

وطن میں قدرِ علم و فن کبھی ہوتی نہیں زاہر
ہُنر والے کو ہر اہلِ وطن نے بے ہُنر جانا

زاہر حیدری

کچھ اُن کی باتیں کچھ اپنی باتیں — کٹتی ہیں یونہی اب غم کی راتیں
جانے یہ دن پھر آئیں نہ آئیں — کچھ اور اشارے کچھ اور گھاتیں
کچھ لے گئے وہ کچھ دے گئے وہ — کوئی نہ سمجھا آنکھوں کی باتیں
چپ کے سوا اب چارہ ہی کیا ہے — گزری ہیں دِل پر کچھ وارداتیں
وہ جیت کر بھی کچھ خوش نہیں ہیں — اب ان کی خاطر کچھ اور ماتیں

سُن لو کہ شاید نہ پھر سُن سکو گے
کہنی ہیں تم سے کچھ ایسی باتیں

خلیل الرحمٰن اعظمی

شام الم کو یاد رکھ، صبح طرب کے بعد بھی
سوزِ جنوں سے کام لے، منزلِ شب کے بعد بھی

دل میں نہ جانے کیا رہا، مثلِ شرارِ جستجو
جوشِ طلب کے وقت بھی، ترکِ طلب کے بعد بھی

تجھ کو بتائیں کیا صبا، ہم نے جلایا کیوں چراغ
آمدِ خور کے باوجود، رخصتِ شب کے بعد بھی

شکر کرو کہ مل گیا، خواہ سبھوں کے بعد ہی
ملتا ہے ورنہ کس کو جام، حسنِ طلب کے بعد بھی

سر میں اگر جنوں نہیں، ملتا نہیں ہے تاجِ فن
علم و نظر کے باوجود، نام و نسب کے بعد بھی

دیکھیں نہ مجھ کو اہلِ بزم، ایسی نظر سے اے نعیمؔ
آیا ہوں میں تو بارہا، بزم میں سب کے بعد بھی

حسن نعیم

یہ کیا ستم ہے کوئی رنگ و بو نہ پہچانے
بہاریں بھی رہے بند تیرے میخانے
فسانے کے زمزمے، رنج و محن کے افسانے
یہی ملے ہیں، نئی زندگی کے افسانے
جو کر گئے ہیں جدا ایک ایک سے ہم کو
دیارِ غرب سے آئے تھے چند دیوانے
جو سُن سکو تو یہ داستان تمہاری ہے
ہزار بار جتایا مگر نہیں مانے
یہ کیا ستم ہے کہ پیرِ مغاں وہی ہے ابھی
نئی ہے بزم نئی مے نئے ہیں پیمانے
تیری نگاہ کی جنبش میں اب بھی شامل ہے
میری حیات کے کچھ مختصر سے افسانے

زہرہ نگاہ

کچھ اس طرح سے تری دل کو یاد آتی ہے
چمن میں تیز ہوا جیسے سنسناتی ہے
تری نگاہ کچھ اس طرح مسکراتی ہے
کہ دل کو یادِ غمِ ہجر آ ہی جاتی ہے
حیاتِ ہجر میں تیرے وہ راگ گاتی ہے
اجل بھی سُن کے جسے جھوم جھوم جاتی ہے
یہ نرم نرم فضائیں یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں
یہ رات جیسے کوئی داستاں سُناتی ہے
اندھیری رات کی تنہائیوں میں اے مضطرؔ
کسی کی یاد مجھے دیر تک رُلاتی ہے

رام کرشن مضطرؔ

بجلی کی زد سے دور نہ خوفِ خزاں سے دور
ہم ہیں تو آشیاں میں مگر آشیاں سے دور
داغِ دل و جگر کی نوازش نہ پوچھیے
یہ گلستاں ہے رسمِ بہار و خزاں سے دور
پہنچے ہیں اس مقامِ محبت پہ ہم کہ اب
سجدہ ہمیں روا ہے ترے آستاں سے دور
دیر و حرم کو چھوڑ بھی آگے نظر بڑھا
حدِ نظر سے وسعتِ کون و مکاں سے دور
جورِ فلک نے خاک نشینوں میں کر دیا
ہم سے زمیں ہے دور نہ ہم آسماں سے دور
گھیرا اُن کی مانگ کو زلفوں نے کس طرح
یہ شب کی ظلمتیں رہیں کیوں کہکشاں سے دور
ہے، ہر طرح سے عشق میں مٹی سحر خراب
کوئے بُتاں میں چین نہ کوئے بُتاں سے دور

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

ستم چاہتا ہوں، جفا چاہتا ہوں
یہی ابتدا، انتہا چاہتا ہوں

نہ پوری ہو وہ التجا چاہتا ہوں
نہ مقبول ہو وہ دعا چاہتا ہوں

نہ پوچھو محبت میں کیا چاہتا ہوں
فنا ہو کے رنگِ بقا چاہتا ہوں

کرم یا ستم سب گوارا ہے مجھ کو
بہ ہر حال تیری رضا چاہتا ہوں

جو اٹھتا ہے رہ رہ کے پہلو میں اکثر
اُسی درد کو جا بہ جا چاہتا ہوں

ملی داد معصومیٔ معصیت کی
سزائیں بہ قدرِ خطا چاہتا ہوں

وہ غم جس کو پایا تھا سب کچھ لُٹا کر
اُسی غم کے ہاتھوں لُٹا چاہتا ہوں

نہ حل ہو سکا آج تک یہ معمہ
وہ کیا چاہتے ہیں میں کیا چاہتا ہوں

ولی آپ شاکر رہیں دردِ دل پر
میں کچھ اور اس سے سوا چاہتا ہوں

سید احمد ولی شاہجہانپوری

خرد صیدِ غمِ کون و مکاں ہے — جنوں کون و مکاں پر حکمراں ہے

یہ نادانوں جواہر کی دوکاں ہے — یہاں حسنِ نظر کا امتحاں ہے

تمہارے دم قدم سے گلستاں ہے — جدھر تم ہو اُدھر سارا جہاں ہے

ذرا اے طائرانِ وقت ہشیار — بڑی کمزور شاخِ آشیاں ہے

سحر کو ظلمتیں گھیرے ہوئے ہیں — نکل اے نیرِ تاباں کہاں ہے

خودی کی جستجو میں جان دینا — حقیقت میں حیاتِ جاوداں ہے

فریبِ دوستی کھائے ہوئے ہوں — مرا جینا بھی مرگِ ناگہاں ہے

وہ کلیاں بن کھلے مرجھا رہی ہیں — کہ جن پر انحصارِ گلستاں ہے

مری بربادیوں پر ہنسنے والے — اب اس کے بعد تیرا امتحاں ہے

مرے افسانے کو شہرت نہ دیجئے — کہ اس میں آپ کی بھی داستاں ہے

الٰہی خیر میرے کارواں کی — جسے دیکھو امیرِ کارواں ہے

شبِ فرقت ستاروں کی چمک بھی
دلِ بسمل پہ ضربِ ناگہاں ہے

بسمل شاہجہاں پوری

یونہی رہا جو مذاق سخن تو کیا ہوگا
کہیں وہ ہو گئے وعدہ شکن تو کیا ہوگا

بقدرِ ظرف پیو میکشو خدا کے لئے
چھلک اٹھی جو شرابِ کہن تو کیا ہوگا

بنا رہا ہوں نشیمن بشوق گلشن میں
شمیم گل ہوئی شعلہ فگن تو کیا ہوگا

دماغ کرتی ہے کیا فصلِ گل پہ اے بلبل
اگر رہی نہ بہارِ چمن تو کیا ہوگا

یہ بخت شمع سے کہتا ہے رو کے پروانہ
اجڑ گئی یہ کہیں انجمن تو کیا ہوگا

بہاؤالدین بخت فرخ آبادی

میں نے تجکو ترے انداز سے پہچان لیا
جنبشِ چشم فسوں ساز سے پہچان لیا

تجکو بھی مجھ سے لگاوٹ ہے یقیناً اے دوست
اضطرابِ نگہِ ناز سے پہچان لیا

یہ حجاباتِ نظر کچھ بھی نہیں ہیں اے دوست
میں نے تجکو تری آواز سے پہچان لیا

دل میں کیوں گرمی انفاس کی لہریں دوڑیں
میں نے تجکو لبِ اعجاز سے پہچان لیا

میرے لب تک تو نہ آیا کبھی شکوہ لیکن
اُس نے مرے دلِ غماز سے پہچان لیا

اور طائر بھی تو سرگرم سفر تھے لیکن
مجکو صیّاد نے پرواز سے پہچان لیا

تیرے اشعار کی نُدرت کو سبھی نے علمی
تیری تخئیل کی پرواز سے پہچان لیا

غلام احمد علمی

زبان بندی ہزار کیجے، یہ ختم اب داستاں نہ ہوگی
نگاہیں کہہ دیں گی رازِ الفت، نہ ہوگی منہ میں زباں نہ ہوگی

تمہارے در سے نہ اٹھ سکوں گا، یہ ذوقِ سجدہ ہی عاشقانہ
مری جبیں ہے جبینِ الفت یہ وقفِ ہر آستاں نہ ہوگی

تمہاری اِن مسکراہٹوں نے کسی کے دل کا قرار چھینا
سکونِ دل کو نہ چینِ شب کو لبوں پہ اب بھی فغاں نہ ہوگی

ہم ہی ہیں امن و اماں کے بانی ہم ہی سے قائم ہے زندگانی
ہمارا حصہ ہے رہنمائی۔ نصیبِ ہر کارواں نہ ہوگی

کہیں چھپائے سے چھپ سکا ہے، یہ راز ہمدم ہے رازِ الفت
حدود باندھیں، ہزار لیکن یہ بات دل میں نہاں نہ ہوگی

یہ کاروبارِ جنوں ہے گوہر۔ رہینِ نفع و ضرر نہ ہونگے
یہ زندگانی ہے عاشقانہ اسیرِ سود و زیاں نہ ہوگی

ڈگمبر پرشاد گوہر دہلوی

شرر

بات رہتی اگر فسانے تک　　برق جاتی نہ آشیانے تک
آؤ تاروں کی نرم چھاؤں میں　　گھوم آئیں شراب خانے تک
چشمِ گریاں ابھی سے آنسو کیوں　　خون رونا ہے مسکرانے تک
پرسشِ حالِ غم، ارے توبہ　　آپ آتے غریب خانے تک
دیکھئے اب چمن پہ کیا گزرے　　مژدۂ نوبہار آنے تک
سو ہی جاؤں گا اے شررؔ آخر
بے قراری ہے نیند آنے تک

شررؔ فتحپوری

رسم و رہ بڑھ کے چاہ تک پہنچے ۔۔۔ چاہ اُن کی نباہ تک پہنچے
طرۂ امتیازِ شانِ حسن ۔۔۔ کاش اُس کج کلاہ تک پہنچے
میری فردِ عمل کو تاب کہاں ۔۔۔ اُن کی زُلفِ سیاہ تک پہنچے
کتنے یوسف ہیں غرقِ آب ابھی ۔۔۔ قافلہ کوئی چاہ تک پہنچے
کیسے ممکن ہے نرگسِ شہلا ۔۔۔ اس گلستاں نگاہ تک پہنچے
کِس کو ہے ذوقِ آبلہ پائی ۔۔۔ کون اُلفت کی راہ تک پہنچے
جستجو میں تیری ہم آوارہ ۔۔۔ منزلِ مہر و ماہ تک پہنچے
زُہد بے راہِ عشق ناممکن ۔۔۔ حُسن کی بارگاہ تک پہنچے
کس کو مقدور ہے محبّت میں ۔۔۔ میرے حالِ تباہ تک پہنچے
سجدے کر کے ثواب کے قرنوں ۔۔۔ یہ ملائک گناہ تک پہنچے
ق
ہم سراپا گناہ پہلے دن ۔۔۔ منصبِ عزّ و جاہ تک پہنچے
اتنی توفیق آہ کو کب ہے ۔۔۔ آپ کی بارگاہ تک پہنچے

حالتِ زارِ بلبلِ گلزار
کاش گُل کی نگاہ تک پہنچے

پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی

پلکوں پہ آج اُن کی یوں اشک جھلملائے
شبنم کی بوند جیسے کانٹے پہ تھرتھرائے
اس زندگی میں اکثر ایسے بھی دور آئے
دل خون رو رہا تھا اور میں نے گیت گائے
شاید اسی طرح کچھ دل کو قرار آئے
میں اس کو بھول جاؤں وہ مجھ کو بھول جائے
کیا پوچھتے ہو مجھ کو طرزِ خرام اُس کا
جس نے قدم قدم پر جادو نئے جگائے
یوں جاگتی ہے اکثر اس دل میں یاد تیری
ساون میں جیسے کوئی کمسن ملہار گائے
انگڑائی لے کے اٹھی وہ نازنیں سحر کو
جیسے فضا چمن کے پہلو میں کسمسائے
اے نقشؔ دیدنی ہے وہ دلکشا سماں جب
کلیوں کی انکھڑیوں میں کچھ کچھ خمار آئے

مہیش چند نقشؔ

اظہار

جب ہوا دل کو سکوں اُن کا خیال آ ہی گیا
جھومتا آنکھوں میں بر برشگال آ ہی گیا

یک بیک بیتے ہوئے لمحوں کی باہیں اُٹھ گئیں
اُس عنایت سے ملے ماضی کو حال آ ہی گیا

وہ اک آنسو عظمتِ دل جس میں پنہاں تھی کبھی
آخر ایک دن بن کے آنکھوں میں سوال آ ہی گیا

زندگی کی تلخیوں سے جب ہوا انساں دوچار
عشق کی بے چینیوں میں اعتدال آ ہی گیا

نغ[illegible] اظہار میں دل کی رمیدہ حسرتیں

مخمور سعیدی

وہ شکل پیشِ نظر تو کبھی نہیں ہوتی
مگر اب آنکھ سے مستور بھی نہیں ہوتی

کبھی کبھی تو محبت میں پائی جاتی ہے
نصیبِ حسن بھی جو دلکشی نہیں ہوتی

اب اُن کو دیکھ کے آنکھوں میں اشک ہوتے ہیں
اب اُن کو دیکھ کے لب پر ہنسی نہیں ہوتی

ہے مقتضائے محبت، غمِ جدائی بھی
محبت آرزوِ قرب ہی نہیں ہوتی

خدا ہی جانے کس اُمید پر دھڑکتا ہے
وہ دل، کہ جس کو تمنا تری نہیں ہوتی

حیاتِ عشق، اُسی آگہی کو کہتے ہیں
نصیبِ عقل جو دم بھر کو بھی نہیں ہوتی

تری نگاہ گریزاں نے دل کو بخشی ہے
خطا وہ عشق سے سرزد کبھی نہیں ہوتی

یہ حال ہے کہ اب اس دل کی خلوتِ غم میں
کبھی کبھی تو تری یاد بھی نہیں ہوتی

ہے میری صبحِ الم کا مقدر اے مخمور
کسی کی رات [illegible] سحر تو

جیسے فضا چمن کے پہلو میں سمسائے
اے نقش دیدنی ہے وہ دلکشا سماں جب
کلیوں کی انکھڑیوں میں کچھ کچھ خمار آئے

مہیش چند نقش